تجلیاتِ خورشید

(نظمیں)

حکیم سید خورشید حسن خورشید سہارن پوری

تحقیق وتدوین:

شعبان جھلن شعبان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ- یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

سورۃ الاحزاب آیت نمبر ٥٦

ترجمہ : بیشک اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں۔

اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود اور خوب سلام بھیجو۔

تجلیاتِ خورشیدؔ

(مولوی حکیم سید خورشید حسن خورشیدؔ سہارن پوری کی اردو نظمیں)

تحقیق وتدوین:

شعبان جُھلن شعبانؔ

تجلیاتِ خورشیدؔ

(مولوی حکیم سید خورشید حسن خورشیدؔ سہارن پوری کی اردو نظمیں)

تحقیق و تدوین:

شعبان جُھلن شعبانؔ

بُک لینڈ شاپ، رحیم یار خان

جملہ حقوق محفوظ

ضابطے

کتاب کا نام	:	تجلیاتِ خورشیدؔ
شاعر	:	خورشید حسن خورشیدؔ سہارن پوری
تحقیق وتدوین	:	شعبان جُھلن شعبانؔ
سکیچ	:	اقبال احمد کھوکھر
سرِ ورق	:	آفرین رزاق
کمپوزنگ	:	جام شاہ جہاں جُھلنؒ
پروف ریڈنگ	:	کوثر عرفان، مظہر فرید فریدی
پیشکش	:	جام محمد عمران، جام محمد رمضان
ناشر	:	بک لینڈ پبلشرز، رحیم یار خان
اشاعت اول	:	اگست ۲۰۲۵ء
ڈیجیٹل اشاعت	:	جون۲۰۲۶ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۹۹۹

کتاب کے حصول کے لیے رابطہ

0300-9671265

انتساب

محافظِ کلامِ خورشیدؔ

کوثر عرفان کے نام

کوثر عرفان اور تجلیاتِ خورشید

ادب کی بقا صرف اس بات پر موقوف نہیں کہ کوئی شاعر یا ادیب اپنی زندگی میں بہترین تخلیقات پیش کر جائے، بلکہ اصل کمال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ان تخلیقات کی حفاظت، تحقیق و تدقیق اور تدوین کے ذریعے آنے والی نسلوں تک پہنچایا جائے۔ اگر سید خورشید سہارن پوری کا کلام آج کے عہد میں ہمارے سامنے موجود ہے اور ہم اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اس کی تجلیات سے روشنی حاصل کر رہے ہیں تو اس میں سب سے بڑا حصہ ان کی نواسی، محترمہ **کوثر عرفان** کا ہے۔

کوثر عرفان نے قریب تین دہائیاں اپنے نانا کے کلام کی نہایت محبت اور عقیدت کے ساتھ حفاظت کی۔ یہ کام محض ایک خاندانی امانت کو سنبھالنے تک محدود نہ تھا، بلکہ ان کے دل میں یہ خواہش بھی شدید تھی کہ حکیم خورشید سہارن پوری کا یہ قیمتی سرمایہ ادبی دنیا کے سامنے آسکے۔ انھوں نے نہ صرف مخطوطات کو محفوظ رکھا بلکہ وقتاً فوقتاً تحقیق و جستجو کے ذریعے ان گوشوں کو بھی اجاگر کیا جو بظاہر نگاہوں سے اوجھل تھے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر دیوانِ خورشید کی اشاعت میں کوثر عرفان کا کردار "محافظت اور امانت داری" کا تھا، تو **تجلیاتِ خورشید** کے پس منظر میں ان کی حیثیت "رہنمائی اور تحقیق" کی ہے۔ انھوں نے اپنی جستجو، بصیرت اور خاندانی روایات کے ذریعے اس تحقیقی سفر کو وہ استحکام عطا کیا جس کے بغیر یہ کتاب ممکن نہ تھی۔

ان کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے صرف خاموشی سے کلام کو محفوظ نہیں رکھا بلکہ خود بھی اس تحقیق کا حصہ رہیں۔ متعدد مواقع پر ان کے مشاہدات اور انکشافات نے ایسے نئے راستے دکھائے جہاں سے مواد حاصل ہوا یا گم شدہ حوالوں تک رسائی ممکن ہوئی۔ بعض مخطوطات کے گرد موجود ابہام انہی کی گفتگو اور رہنمائی سے دور ہوا۔ اسی طرح کئی خاندانی حالات اور حالاتِ زمانہ کے وہ پہلو سامنے آئے جو خورشید سہارن پوری کی شخصیت اور ان کے شعری سفر کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی کم اہم نہیں کہ کوثر عرفان نے وقت کی تلخیوں اور زندگی کے نشیب و فراز کے باوجود اپنے ذاتی شوق اور عزم کو ہمیشہ قائم رکھا۔ انہوں نے مخطوطات کو صدیوں پرانی کتب کی طرح حرزِ جاں بنایا اور کبھی بھی ان کے ادبی و تحقیقی قدری پہلوؤں کو فراموش نہیں کیا۔ اسی استقامت اور محنت کا نتیجہ ہے کہ آج ہم خورشید سہارن پوری کے کلام کو محض ایک دیوان تک محدود نہیں دیکھ رہے، بلکہ ان کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کے مختلف پہلوؤں سے منور ہو رہے ہیں۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ خورشید سہارن پوری کی نواسی نے ہم پر کامل اعتماد کیا اور اپنے نانا کا ادبی ورثہ ہمارے حوالے کر دیا۔ **تجلیاتِ خورشید** کے ورق ورق کے پیچھے کوثر عرفان کی رہنمائی اور تحقیق کی شعاعیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ تجلیات ان کی جستجو اور اعتماد کا ہی ثمر ہے۔

شعبان جھلن شعبانؔ، رحیم یار خان

مقدمہ

شاعری محض الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ جذبات، خیالات اور تجربات کی وہ نازک تصویریں ہیں جو انسانی روح کے لطیف گوشوں کو منور کر دیتی ہیں۔ برصغیر کی اردو شاعری نے اپنے طویل اور درخشاں سفر میں ایسے نابغہ روزگار شعرا کو جنم دیا جنھوں نے نہ صرف اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کیا بلکہ آنے والے زمانوں کے لیے بھی تخلیقی سرمایہ چھوڑا۔ انھی میں ایک درخشندہ نام **حکیم مولوی سید خورشید حسن خورشیدؔ سہارن پوری** کا ہے۔ جن کی شاعری کا نچوڑ ان کے دیوان اور تجلیاتِ خورشید میں جلوہ گر ہے۔

تجلیاتِ خورشید محض کلام کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک فکری، فنی اور روحانی آئینہ ہے۔ جس میں شاعر نے کلاسیکی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے عہد کے اجتماعی اور انفرادی مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ شاعر کا تخیل، زبان پر قدرت، مضامین کی ندرت، اور عروضی کمالات مل کر اس مجموعے کو اردو ادب میں ایک وقیع اضافہ بنا دیتے ہیں۔

خورشید حسن خورشید سہارن پوری: حیات اور عہد

خورشید حسن خورشید ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء (جبکہ روایات میں ۱۸۶۲ء بھی ملتا ہے) میں سہارن پور کے اُس علمی و تہذیبی ماحول میں پیدا ہوئے جس کی ہر گلی میں مدرسہ، خانقاہ، مطبع یا شعر و سخن کی محفل ملتی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں فارسی کی صدیوں پر محیط بالادستی کمزور پڑ رہی تھی اور اردو بطور تہذیبی و ادبی زبان مستحکم ہو رہی تھی۔ میرؔ و غالبؔ کی روایت تازہ تھی، حالیؔ، شبلیؔ اور بعد کے اصلاحی رجحانات فضا میں نمو پا رہے تھے۔ یہی وہ فکری پس منظر تھا جس میں خورشید سہارن پوری نے شعری ذوق سنبھالا، کلاسیکی محاکاتِ حسن و عشق سے آشنا بھی رہے اور

وقت کی تبدیلیوں سے باخبر بھی۔

ہجرت سے پہلے حکیم مولوی سید خورشید حسن خورشیدؔ سہارن پوری کی رہائش سرائے سادات، موضع کھتری والا (تحصیل سہارن پور) میں تھی اور آبائی نسبت ساڈھوڑہ شریف، ضلع انبالہ (صوبہ ہریانہ) سے تھی۔ طبابت ان کے خاندانی ورثے اور ذاتی شغف، دونوں کا حاصل تھی۔ باغبانی ان کی دوسری شناخت تھی؛ اپنے باغات میں انواع و اقسام کے درختوں اور پودوں کی آبیاری کرتے، نئے تجربات کرتے اور نتائج قلم بند کرتے۔ اسی ذوق نے انہیں ۱۹۲۶ء میں **"رہبر باغبانی "** جیسی رہنمائے عمل تصنیف تک پہنچایا۔ ان کے ایک شعر میں اسی باطنی رغبت کا اشاریہ ملتا ہے:

خورشیدؔ وصلِ گل مطلب مثلِ بلبلان
زان پیشتر کہ خاکِ رہِ باغبان شوی

تقسیمِ ہند سے ذرا قبل کے حالات کی تفصیل کم سہی، لیکن یہ طے ہے کہ وہ اخبارات و صحافت سے وابستگی کے سبب زمانے کی نبض پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے پیش بینی کے ساتھ اپنے اہلِ خانہ کی ہجرت کا انتظام کر لیا۔ سفر ہجرت کٹھن تھا: بیویاں اور بیٹیاں افتخار بیگم، ارشاد بیگم، اعجاز بیگم ہمراہ تھیں؛ بیٹے سید مختار احمد انور، سید شفیق احمد اور سید آفتاب مرتضیٰ بھی ساتھ تھے۔ راہ کی صعوبتوں میں ایک کم سن بچہ جانبر نہ ہو سکا۔ فضا اس قدر پر تشدد تھی کہ بچیوں کو سیٹوں کے نیچے (صندوقوں میں) چھپا کر لانا پڑا۔ اس ذہنی پژمردگی نے سید شفیق احمد کی طبیعت پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ عمر بھر مجذوبی کی کیفیت میں رہے۔ یہ ہجرت کے اجتماعی صدمے کی ایک ذاتی صورت تھی۔*

* سمہ سٹہ میں بھولے شاہ کے نام سے انھیں کا مزار موجود ہے۔

لاہور پہنچ کر انہیں انارکلی میں ایک عمارت الاٹ ہوئی۔ عمارت میں مشکوک آمد و رفت رہتی؛ ایک عبداللہ نامی شخص اکثر موجود رہتا اور اپنے مسلمان ہو جانے کا دعویٰ کرتا۔ بعد میں ایک حصے سے خزانہ برآمد ہوا جسے خورشیدؔ سہارن پوری نے بلاتردد حکومتِ پاکستان کے حوالے کر دیا۔ امانت و دیانت کے اس واقعے نے ان کی شخصیت اور ساکھ کو اور نمایاں کر دیا، مگر اسی عمارت میں رہائش خطرے سے خالی نہ رہی۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو اہلیہ کے انتقال کے بعد انہوں نے اہلِ خانہ سمیت بہاولپور کا رخ کیا جہاں ان کے ماموں مقیم تھے۔

بہاولپور میں خورشیدؔ سہارن پوری نے علمی و ادبی منظر نامے میں جلد جگہ بنالی۔ یہاں کی محفلیں، انجمنیں اور ریاستی اخبارات ان کے اشعار، مضامین اور کالموں سے آباد رہتے۔ مولانا نصیر الدین حسن خرم بہاول پوری سے روحانی و ادبی نیاز مندی بڑھی، حیات میرٹھی سے بھی گرم جوشی کے تعلقات قائم ہوئے۔ انہوں نے سنجیدہ تحریروں کے ساتھ مزاحیہ اور طبی کالم بھی لکھے۔ یوں ان کی شخصیت شاعر، حکیم اور صحافی تینوں جہتوں میں ایک ہمہ گیر پیکر بن کر ابھری۔

۱۹۵۱ء میں بینائی جاتی رہی تو کچھ عرصہ خلوت نشینی کا مرحلہ آیا، مگر یہ توقف تخلیقی انقطاع میں نہیں بدلا۔ ریاستی الاٹمنٹ کے تحت انہیں زرعی اراضی ملی؛ شہری جائیداد کے دعوے پر بہاولپور میں مطب اور رحیم یار خان میں مطب مع چکی الاٹ ہوئے۔ بہاولپور میں انہوں نے "دارالحکمت، فتح خاں بازار" کے نام سے مطب کھولا اور خلقِ خدا کی خدمت میں پھر مشغول ہو گئے۔ طبابت ان کے لیے محض پیشہ نہیں، مزاج اور مِشن تھا۔

رحیم یار خان کے مطب و چکی پر عملی قبضہ کسی اور کے پاس تھا، اسی تنازعے کی سماعت ۲۶۔ مارچ ۱۹۵۷ء کو عدالت میں تھی کہ وہیں اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ تدفین رحیم یار خان ہی میں ہوئی۔ آج ان کی تربت کی تلاش ایک اخلاقی و ادبی قرض کی صورت جاری ہے، کہ اہلِ دل اپنے محسن کی نشانی ڈھونڈ کر اسے اہلِ ادب کے سپرد کریں۔

اس داستانِ حیات کا ایک رمز آشنا موڑ یہ ہے کہ جس شہر میں ان کا ظاہری سفر ختم ہوا، سات دہائیوں بعد اسی شہر سے ان کی ادبی زندگی نے نئی تابناکی کے ساتھ پھر جنم لیا۔ **یہ ایک لحاظ سے ان کا "دوسرا جنم" ہے۔** قدرت کا وہ کرشمہ جس نے خورشیدؔ سہارن پوری کے نام کو **"دیوانِ خورشید "** اور **"تجلیاتِ خورشید "** کی صورت میں **رحیم یار خان ہی سے** دوبارہ جلوہ گر کیا، اور اس احیائے نو میں مجھ فقیر **شعبان جھلن شعبان** کی محنت بنیادی سنگِ میل ثابت ہوئی۔ یوں ان کا نام محض تاریخ کے صفحات میں محفوظ نہیں رہا بلکہ معاصر قارئین کے ذوق اور نقد کے افق پر روشن ہو گیا۔

احوالِ خورشید حسن خورشیدؔ سے عیاں ہوتا ہے کہ ایک باوقار فنکار کے لیے حیاتِ فانی کی حدیں حتمی نہیں۔ کلاسیکی روایت سے رشتہ، عہد کے نشیب و فراز کا ادراک، دیانت و خدمت کا شخصی حوالہ، اور آخر میں ادبی احیا، یہ سب مل کر ایک ایسی کل بنا دیتے ہیں جس میں شاعر کی شخصیت، زمانے کی تاریخ اور ادب کا سفر ایک دوسرے کو معنی دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وہ قرابت ہے جو خورشیدؔ سہارن پوری کو محض ایک نام نہیں رہنے دیتی، بلکہ ایک عہد اور ایک سلسلے کی علامت بنا دیتی ہے۔

ادبی پس منظر اور تخلیقی سرچشمے

خورشیدؔ سہارن پوری کا عہد برصغیر کی سیاسی اور سماجی ہلچل کا عہد تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی یاسیت کے اثرات ابھی باقی تھے، مسلمان ایک طرف مایوسی کا شکار تھے تو دوسری طرف احیائی تحریکات (علی گڑھ تحریک و دیگر) نئی فکری توانائی پیدا کر رہی تھیں۔ اسی پس منظر میں شاعر نے اپنے کلام میں ایک طرف **اسلامی شعور اور روحانی اقدار** کو نمایاں کیا اور دوسری طرف **محبت، رومان اور انسانی درد** کو بھی جگہ دی۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی روایت کی جھلک صاف دکھائی دیتی

ہے لیکن ساتھ ہی کہیں کہیں نئے مضامین اور بدلتے ہوئے سماجی حالات کی تصویریں بھی موجود ہیں۔ یہ امتزاج ان کے کلام کو مزید دلکش بناتا ہے۔

فکری محاسنِ شاعری

حمد و نعت

تجلیاتِ خورشید میں سب سے نمایاں پہلو **حمد اور نعت** ہے۔ شاعر کا دل عشقِ الٰہی اور محبتِ رسول ﷺ کے نور سے لبریز ہے۔ ان کی حمدیہ شاعری میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قدرت اور شانِ ربوبیت کے دل آویز نقشے ملتے ہیں۔ ان کے اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر محض رسمی حمد گو نہیں بلکہ ایک سچے مومن کی زبان سے نکلے ہوئے خالص جذبات ہیں:

وہ جو ٹوٹی ہوئی کشتی بھنور میں تھام لیتا ہے
وہ جس کا ناخدا طوفاں میں گھر کر نام لیتا ہے
وہی مولا ہے میرا جس کی درگاہِ عطوفت سے
دعائے عام پر خورشیدؔ خاص انعام لیتا ہے

اسی طرح ان کی نعتیہ شاعری میں نبی کریم ﷺ کے جمال و کمال اور انسانیت کے لیے آپ ﷺ کے پیغامِ رحمت کو بڑے والہانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے اشعار میں عقیدت و محبت کی چمک اور ایک خاص وجدانی کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے:

حسنِ حسیناں تم ہی تو ہو، رشکِ مہِ کنعاں تم ہی تو ہو
دستِ زلیخا جس پہ بڑھا، وہ حسن بداماں تم ہی تو ہو

ہم پہ تمھارے کتنے ہیں احساں، تم نے دیا ہے ہم کو قرآں
دین و یقینِ قلبِ مسلماں، قبلۂ ایماں تم ہی تو ہو

منقبت و مرثیہ

خورشید سہارن پوری نے اہلِ بیتِ اطہار کی مدح میں بھی عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ ان کی منقبتوں میں محبت، وفاداری اور اخلاص کی فضا نمایاں ہے۔ بالخصوص حضرت علیؓ کی شان میں لکھے گئے اشعار میں جہاں شجاعت اور علم کا بیان ہے، وہیں روحانی بصیرت بھی ملتی ہے۔

مراثی میں کربلا کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے شاعر نے صرف سانحہ کربلا کو نہیں دکھایا بلکہ اس سے **ایثار، قربانی اور حق پر ڈٹ جانے** کا سبق اخذ کیا ہے۔ ان کے اشعار قاری کو رلا بھی دیتے ہیں اور حوصلہ بھی بخشتے ہیں:

اے شبِ قتلِ حسین ایسا اندھیرا کوئی
کیا تہہِ چرخ کہیں تو نے بھی دیکھا کوئی

رو کے سقائے حرم بولے کہ اے نہرِ فرات
تو نے بھی دیکھا ہے پیاسا کبھی مجھ سا کوئی

قومی و ملّی شعور

خورشید سہارن پوری کی شاعری محض روحانی موضوعات تک محدود نہیں بلکہ ان میں **قومی و ملّی شعور** بھی نمایاں ہے۔ تحریکِ آزادی کے اثرات اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا نوحہ ان کی نظموں اور قطعات میں ملتا ہے۔ وہ قوم کو بیداری، عمل اور اتحاد کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کے اشعار آج بھی دلوں میں ولولہ پیدا کرتے ہیں:

خورشیدؔ اسی اک دانہ سے جو خاک میں پہلے ملتا ہے

صحرائے عمل کی وادی میں گلزارِ تمنا کھلتا ہے

رومانوی مضامین

کلاسیکی اردو شاعری کی طرح خورشیدؔ سہارن پوری کے یہاں بھی عشق و محبت کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ تاہم ان کے یہاں عشق محض جسمانی یا سطحی نہیں بلکہ ایک وسیع تر روحانی پس منظر کا حامل ہے۔ حسنِ محبوب ان کے کلام میں حسنِ حقیقی کا استعارہ بن کر آتا ہے۔ اس طرح وہ روایتی شاعری کو نئی روح عطا کرتے ہیں۔

بلور میں ہیں رنگِ شہابی

رخسار ان کا یا ہے گلابی

صورت کا نقشہ کل آفتابی

تصویر رنگیں چہرہ کتابی

آنکھوں کے اندر شوخی بلا کی

شاکی خدائی جس کی جفا کی

نظموں کا فکری مطالعہ

خورشید سہارن پوری کی نظموں میں فکری وسعت اور موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں صرف نعتیہ یا مدحیہ نہیں بلکہ فلسفیانہ و سماجی پہلوؤں کی حامل بھی ہیں۔

- **نعتیہ نظمیں**" : معجزۂ معراج" میں شاعر نے نبی کریم ﷺ کے سفر معراج کو نہایت بلاغت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نظم میں الوہی شان اور شعری جوش ایک دوسرے میں یوں پیوست ہیں کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے۔
- **سلامیہ شاعری** : سلامیہ کلام میں جذباتی شدت عروج پر ہے۔ امام حسینؑ کی شہادت اور کربلا کے غم کو شاعر نے ایسے دل دوز پیرائے میں بیان کیا ہے کہ دل لرز اٹھتا ہے:

ے گوہرِ اشک پرو تارِ نگاہِ غم میں

تا بنے قاسمِ نو شاہ کا سہرا کوئی

- **فلسفیانہ نظمیں**:" خدا سے التجا" میں شاعر وجودی اور روحانی سوالات اٹھاتے ہیں۔ یہ نظم ان کے داخلی کرب اور خدا سے قربت کی تڑپ کی آئینہ دار ہے۔

ے گم کردۂ پرواز کو مایوسِ قفس کر

صیاد کی خواہش کہ کچھ اور سزا دے

رباعیات وقطعات

خورشید سہارن پوری نے رباعیات اور قطعات میں بھی اپنی قدرتِ کلام کا ثبوت دیا ہے۔رباعیات میں اکثر **تأمل و تفکر** کی کیفیت پائی جاتی ہے۔وہ زندگی، موت، محبت اور کائنات کے موضوعات پر عمیق نظر ڈالتے ہیں۔قطعات میں انہوں نے **سماجی طنز و تنقید** بھی پیش کی ہے اور اصلاحی پہلو بھی نمایاں ہے۔

فنی محاسن

خورشید سہارن پوری کی شاعری میں فنی سطح پر کئی نمایاں خصوصیات ملتی ہیں:

(الف)ہیئت کا تنوع

انہوں نے تقریباً تمام شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے: غزل، قصیدہ، نظم، سلام، مرثیہ، مثنوی، رباعیات اور قطعات۔ان کے یہاں غزل کی لطافت بھی ہے اور نظم کا ارتکاز بھی۔یہ کثرتِ ہیئت ان کی **ہمہ جہتی فنی صلاحیت** کا ثبوت ہے۔

(ب)عروضی پختگی

ان کے اشعار میں بحر و وزن کی پابندی غیر معمولی درجے کی ہے۔کہیں بھی سقم یا تکلف محسوس نہیں ہوتا۔اکثر وہ **سہلِ ممتنع** کی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں،یعنی بظاہر سادہ شعر جس میں درحقیقت بڑی فنی پیچیدگی پوشیدہ ہوتی ہے۔

(ج) قافیہ وردیف کا حسن

ان کی شاعری میں قافیے اور ردیف کا استعمال محض ضروریاتِ شعر کے تحت نہیں بلکہ فکری تسلسل اور صوتی نغمگی پیدا کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ خاص طور پر سلامیہ کلام میں سلام کی ردیف ایک وجدانی کیفیت قائم کرتی ہے۔

اسلوبیاتی خصوصیات

خورشید سہارنپوری کے اسلوب کی چند نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

سادگی اور روانی : ان کے بیشتر اشعار عام فہم ہیں، قاری کو الجھاتے نہیں بلکہ دل میں اترتے جاتے ہیں۔

صنائع اور بلاغت : وہ تشبیہ، استعارہ اور تلمیح کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

ع ہر نقشِ پا کو طور بناتا چلا گیا

یہ مصرع علامتی اظہار کی بہترین مثال ہے۔

جذبات کی شدت : ان کے کلام میں درد، سوز اور رقت کا غلبہ ملتا ہے۔

عقیدت و ایمانی وابستگی : نعت اور سلام ان کے کلام کی جان ہیں، جن میں عشقِ رسول ﷺ اور عشقِ اہلِ بیتؑ اپنی معراج پر نظر آتے ہیں۔

اصلاحی اور تعلیمی پہلو : ان کے اشعار میں اخلاقی سبق اور اصلاحی پیغام بار بار جھلکتا ہے۔

خورشید سہارنپوری کی شاعری: اسلوبیاتی ولسانیاتی مطالعہ

خورشید حسن خورشید سہارنپوری کی شاعری محض جذبات کا اظہار نہیں بلکہ ایک ایسا اسلوبیاتی تجربہ ہے جو اردو شعری روایت میں اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے ہاں **لسانی سادگی**، **علامتی لطافت**، **صوتی حسن** اور **بلاغتی صنعتیں** بیک وقت جلوہ گر ہیں۔

زبان کی سادگی اور فصاحت

خورشید سہارنپوری کی زبان پیچیدہ نہیں۔ وہ ایسے الفاظ منتخب کرتے ہیں جو قاری کے دل میں براہِ راست اتر جاتے ہیں۔

شامِ اقصیٰ کے دولہا مجھے بھیک دے
سہرا گاتا ہوں تیرا مجھے بھیک دے
اے حسینوں میں اعلیٰ مجھے بھیک دے
اے مرے سروِ بالا مجھے بھیک دے
اے شہنشاہِ والا مجھے بھیک دے

یہاں زبان کی سادگی اور سلاست نمایاں ہے۔ **مشکل تراکیب یا ثقیل الفاظ** کے بجائے سادہ اور رواں جملے استعمال ہوئے ہیں جن میں اثر پذیری زیادہ ہے۔

علامتی واستعاراتی رنگ

خورشید سہارنپوری کے ہاں **استعارہ** اور **تشبیہ** کا استعمال ان کے اسلوب کو جمالیات بخشتا ہے۔

ہر نقشِ پا کو طور بناتا چلا گیا
دشت و جبل کو سرمہ بناتا چلا گیا

یہاں "نقشِ پا" کو "طور" کہنا، اور "دشت و جبل" کو "سرمہ بنانا" صنائع بدائع میں علم و عرفان کی علامت بنانا اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر محض بیان نہیں کرتا بلکہ قاری کے ذہن میں منظر ابھارتا ہے۔

صوتی حسن اور ترنم

ان کی شاعری میں الفاظ کی نشست و برخاست اور صوتی ہم آہنگی قاری کو گنگنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

درِ حضور پہ بہرِ سلام آتے ہیں
کرم کرم کے تمہارے غلام آتے ہیں
عطا عطا کے ترا سن کے نام آتے ہیں
سخا سخا کے بھکاری تمام آتے ہیں

یہاں "کرم کرم، عطاعطا، سخاسخا" کی تکرار اور قافیہ و ردیف کی موسیقیت اشعار میں ترنم پیدا کرتی ہے۔ یہ اسلوبی حسن خورشید کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔

بلاغتی صنعتوں کا استعمال

خورشید سہارنپوری نے اپنی شاعری میں مختلف **بلاغتی صنعتیں** بر محل برتی ہیں:

- **تلمیح:**

ے ترے جلوؤں سے نظریں جھک گئیں صلِّ علیٰ کہہ کر
کبھی شمس الضحیٰ کہہ کر کبھی بدر الدجیٰ کہہ کر

یہاں "شمس الضحیٰ" اور "بدر الدجیٰ" قرآنی تلمیحات ہیں۔

- **تضاد:**

ے کہتے ہیں ایک ماہ سے جو چیز تھی حرام
تھوڑی سی محتسب نے بھی اب تو حلال کی

یہ صنعتیں شعر میں گہرائی اور حسن پیدا کرتی ہیں۔ اسی طرح ایک ہی قطعہ میں اصنعات اور فنی محاسن ملاحظہ کریں۔

کس لیے قصہ قیامت کا سناتے ہیں مجھے
زاہدانِ خشک کیوں اتنا ڈراتے ہیں مجھے
ہوں سیہ کاری میں یکتا مثلِ سرمہ گرچہ میں
جو نظر رکھتے ہیں آنکھوں میں بٹھاتے ہیں مجھے

تشبیہ و تمثیل:

شاعر نے اپنی سیہ کاری کو "مثلِ سرما" کہا ہے۔ یعنی وہ اپنی گناہ گاری کو موسمِ سرما کی تاریکی اور سردی سے تشبیہ دے رہا ہے۔ یہ ایک بلیغ اور بامعنی تشبیہ ہے۔

مبالغہ:

"ہوں سیہ کاری میں یکتہ" میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ شاعر اپنی خطاؤں کو حد سے بڑھا کر بیان کرتا ہے تاکہ قاری پر اثر ہو۔

استفہام انکاری:

"کس لیے قصہ قیامت کا سناتے ہیں مجھے؟" اور "کیوں اتنا ڈراتے ہیں مجھے؟" سوالیہ انداز میں بات کہہ کر اصل مقصد یہ ہے کہ شاعر دراصل ایسے ڈرانے کو بے جا سمجھتا ہے۔ اس میں انکاری رنگ جھلکتا ہے۔

حسنِ تضاد:

زاہدانِ خشک کا ڈرانا اور پھر "جو نظر رکھتے ہیں آنکھوں میں بٹھاتے ہیں مجھے" میں تضاد پیدا ہوا ہے۔ ایک طرف خوف دلانے والے ہیں، دوسری طرف وہ ہیں جو محبت اور عزت دیتے ہیں۔

سلاست وروانی:

قطعہ عام فہم الفاظ اور نرم بحر میں ہے۔ مصرعوں میں روانی، توازن اور آہنگ پایا جاتا ہے۔

ایجاز: کم الفاظ میں زیادہ مفہوم ادا ہوا ہے، خاص طور پر "مثلِ سرما" اور "آنکھوں میں بٹھاتے ہیں"۔

جذبے اور اسلوب کا امتزاج

خورشید سہارنپوری کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ ان کے ہاں **جذبات اور اسلوب ایک دوسرے سے ہم آہنگ** نظر آتے ہیں۔ جہاں غم ہے وہاں زبان بھی دردناک ہے، جہاں دعا ہے وہاں لہجہ عجز لیے ہوئے ہے، اور جہاں نعت ہے وہاں تقدیس اور عقیدت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔

مثال کے طور پر نعتیہ شعر:

ے حسنِ یوسف عشقِ زلیخا تم، ید بیضا تم دم عیسیٰ
جانِ عالم جانِ جہاں خورشیدؔ کے جاناں تم ہی تو ہو

یہ شعر بتاتا ہے کہ شاعر کا جذبہ (عقیدت) اور اسلوب (عاجزی و انکساری) ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

صنف کے مطابق اسلوب میں تبدیلی

خورشید سہارنپوری کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ وہ مختلف اصناف میں اپنی زبان اور اسلوب کو **موقع محل** کے مطابق بدل لیتے ہیں:

- نعت میں زبان عقیدت آمیز:

ے شبِ اسریٰ بنایا تھا تمھیں کو مقتدا سب نے
پۓ ختمِ نبوت پیشوائے انبیاء کہہ کر

- سلام میں لہجہ دردناک:

گوہرِ اشک پرو تارِ نگاہِ غم میں
تا بنے قاسمِ نو شاہ کا سہرا کوئی

- رباعیات میں سنجیدگی اور پند و نصائح:

ع اے آذرِ بت تراش کر یاد ذرا
ع اے دوست کنارِ آب محفل کب تک
ع اے دوست یہ دنیا ہے تری خواب خیال
ع اے دوست سمجھ کسی کو دنیا میں نہ کم

یہ انداز ان کے کلام کو یکسانیت سے بچاتی ہیں اور قاری کو تازگی عطا کرتی ہیں۔

اسلوب کی مجموعی پہچان

خورشید سہارنپوری کے کلام کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات میں سادگی و روانی، تصوریت، جذباتی شدت، روحانیت، اصلاحی رنگ شامل ہیں۔ اس طرح خورشید سہارنپوری کا کلام محض ادبی سرمائے میں اضافہ نہیں بلکہ **اردو نظم کی روایت میں ایک انفرادی اسلوب** کی حیثیت رکھتا ہے۔

خورشید سہارنپوری اور اردو شاعری کی روایت میں ان کا مقام

اردو شاعری ایک طویل اور متنوع روایت رکھتی ہے۔ میر، غالب، سودا، ذوق، حالی، اقبال اور دیگر شعرا نے مختلف اسالیب اور موضوعات کو اپنے رنگ میں ڈھالا۔ خورشید حسن خورشید سہارنپوری اسی روایت کے ایک معتبر اور نمایاں شاعر ہیں جنہوں نے کلاسیکی میراث سے فیض حاصل کیا مگر اپنی انفرادیت بھی قائم رکھی۔

میر و غالب کے پس منظر میں خورشید

میر تقی میر کے ہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کی کیفیات ملتی ہیں۔ خورشید کے کلام میں بھی یہ پہلو جھلکتا ہے مگر وہ محض شخصی المیہ پر نہیں رکتے بلکہ اجتماعی اور دینی غم کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔

میرؔ: ع پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

خورشید: ؎ بیبیاں روتی ہیں لاشوں پہ شہیدوں کی اگر
بانیٔ جور سمجھتے ہیں تماشا کوئی

یہاں میر کے ذاتی غم کی جگہ خورشید نے کربلا کے اجتماعی غم کو ترجیح دی۔

غالب کے ہاں فلسفیانہ اور عرفانی مضامین کو بالادستی حاصل ہے۔ خورشید نے بھی فلسفہ اور عرفان سے کام لیا مگر ان کا رجحان زیادہ تر **اسلامی روحانیت** اور **دینی شعور** کی طرف رہا۔

غالبؔ:

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

خورشیدؔ: ؎ وہ جو بنتا ہے مونس آشیانہ جلنے والوں کا

اسیروں کی خبر جو آ کے زیرِ دام لیتا ہے

حالی اور اصلاحی رجحان

حالی نے شاعری میں اصلاحی پہلو کو اجاگر کیا اور قوم کو بیدار کرنے کا پیغام دیا۔ خورشید سہارنپوری کی رباعیات اور قطعات میں بھی یہی رجحان پایا جاتا ہے۔

حالیؔ: اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

خورشیدؔ: احساسِ خودی کی داستاں چھیڑ ذرا

اے مردِ مجاہد یہ بیاں چھیڑ ذرا

تقدیر کے تخیل سے بے کار نہ بن

تدبیر کا کچھ سازِ رواں چھیڑ ذرا

یہاں حالی اور خورشید دونوں کے ہاں وعظ و نصیحت کا پہلو مشترک ہے۔

اقبال اور اسلامی فکر

اقبال کے ہاں اسلامی عظمت اور خودی کا تصور نمایاں ہے۔ خورشید سہارنپوری نے بھی اقبال سے اثر قبول کیا مگر وہ اقبال کی طرح بلند آہنگ اور انقلابی نہیں بلکہ زیادہ عاجزانہ اور دعائیہ لہجے کے شاعر ہیں۔

اقبال:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

خورشیدؔ: اک امر ہے تیرا روحِ پاکِ آدم
ہے علم ترا ہی کائناتِ عالم
پردے میں ہے جو وہ تو ہے باہر میں ہوں
ہے کیا من و ما کے تو ہے ایں ہم آں ہم

یہ فرق بتاتا ہے کہ اقبال کا لب و لہجہ انقلابی ہے، جب کہ خورشید کا لہجہ عجز اور التجا سے معمور ہے۔

نعتیہ شاعری کی روایت

اردو میں نعتیہ شاعری کا ایک منفرد دبستان رہا ہے۔ محسن کاکوروی، حسان الہندی اور اکبر الہ آبادی جیسے شعرا کے بعد خورشید سہارنپوری نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کا کلام **سلاستِ زبان**، **عقیدت و احترام** اور **روحانیت** کے اعتبار سے نمایاں ہے۔

محسن کاکورویؔ: ع بزمِ کونین مـیں جب ذکرِ شہِ ابرار ہوا

خورشیدؔ: محبت کا دل میں بھرتی ہے وفا رنگ

یہ شیشہ نہیں رکھتا اب بد نما رنگ

دو عالم پہ آج ہے صلِّ علیٰ رنگ

گلستاں کے پھولوں پہ چھڑکا گیا رنگ

حسینوں کا پھر روزِ بازار آیا

سلامیہ روایت اور میر انیس دبستان سے تعلق

سلامیہ شاعری میں ان کا رشتہ **میر انیس** اور **دبستانِ لکھنؤ** سے جوڑا جا سکتا ہے۔ مگر خورشید سہارنپوری کی زبان زیادہ سادہ اور براہِ راست ہے، ان کے ہاں واقعات کی تفصیل کم اور جذبے کی شدت زیادہ ہے۔

میر انیسؔ:

جب چڑھ کے نیـزے پر شہِ والاصفات آئے

خورشیدؔ: بیبیاں روتی ہیں لاشوں پہ شہیدوں کی اگر

بانئ جور سمجھتے ہیں تماشا کوئی

لاش اکبرؑ کی جو دیکھی تو لگے کہنے حسینؑ

ہو سفر میں نہ جدا باپ سے بیٹا کوئی

مجموعی تقابل

یوں کہا جاسکتا ہے کہ خورشید سہارنپوری میر کی طرح **غم** کے شاعر ہیں مگر ذاتی نہیں، اجتماعی غم کے۔ غالب کی طرح **فلسفہ** لاتے ہیں مگر اسے فقیری رنگ دیتے ہیں۔۔ حالی کی طرح **اصلاحی رجحان** رکھتے ہیں مگر زیادہ سادہ اور عوامی لہجے میں۔ اقبال کی طرح **فکرِ اسلامی** پیش کرتے ہیں مگر ان کا لب و لہجہ انقلابی کی بجائے عاجزانہ ہے۔ اور نعت و سلامیہ روایت میں اپنی ایک **پہچان** رکھتے ہیں۔

رباعیات وقطعات کا مطالعہ

خورشید حسن خورشید سہارنپوری نے "تجلیاتِ خورشید" میں جہاں نظم و نعت کو اپنا بنیادی وسیلۂ اظہار بنایا، وہیں رباعیات اور قطعات کے ذریعے بھی اپنی فنی پختگی کے اظہار کا وسیہ بنایا ہے۔ یہ اصناف مختصر ہونے کے باوجود معنی کی گہرائی اور فکر کی وسعت کی حامل ہیں۔ ان کے یہاں یہ دونوں اصناف محض مشقِ سخن نہیں بلکہ فکری بصیرت اور جذباتی اظہار کی آئینہ دار ہیں۔

رباعیات کی فکری جہات

ان کی رباعیات زیادہ تر دینی، اخلاقی اور عرفانی مضامین پر مشتمل ہیں۔ رباعی چونکہ چار مصرعوں پر مشتمل صنف ہے، اس لیے اس میں اختصار اور جامعیت بنیادی شرط ہے۔ خورشید سہارنپوری نے اس شرط کو نہایت خوس اسلوبی سے نبھایا ہے۔

نمونہ:

یہ روح بھی ایک امرِ ربانی ہے

فیضانِ خدا ہے فیضِ ربانی ہے
ہو جو تو سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں
ہے رنگِ فنا بقا میں حیرانی ہے

یہ رباعی روح کی حقیقت اور دین سے وابستگی کی تلقین کر رہی ہے۔

قطعات کا فکری کینوس

خورشید سہارنپوری نے قطعات میں زیادہ تر اخلاقی نصیحت، اصلاحِ معاشرہ اور دینی ہدایات کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے قطعات مختصر ہوتے ہیں مگر اثر انگیزی میں بھرپور ہیں۔

نمونہ:

الفاظ سے گزرا ہے تو معنی سے گزر
شذرہ سے گزر کھول کے اپنے شہپر
پرواز ہے تیری لا مکاں کی جانب
لاہوت کے دریا سے بھی چن لے گوہر

یہاں قطعہ ایک مختصر واعظ کی طرح قاری کو سیدھی راہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

خورشید سہارنپوری کی رباعیات اور قطعات ان کے کلام کے اہم حصے ہیں۔ یہ اصناف مختصر ضرور ہیں مگر اپنے اندر فکر و فن کی گہرائی سموئے ہوئے ہیں۔ رباعیات میں عرفان اور دینی جذبہ

نمایاں ہے جبکہ قطعات میں وعظ و نصیحت اور معاشرتی اصلاح کے پہلو نمایاں ہیں۔ ان اصناف میں بھی شاعر کی زبان کی سادگی، بیان کی روانی اور خلوص جھلکتا ہے۔

خورشید حسن خورشید سہارنپوری کا ادبی سفر اردو شاعری کی ایک ایسی کڑی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اپنے عہد کی ادبی، تہذیبی اور مذہبی فضا کو اپنی تخلیقات میں نہ صرف محفوظ کیا بلکہ ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جو سادگی کے باوجود اثر آفرینی میں یکتا ہے۔

تجلیاتِ خورشید ان کی شعری کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ اس میں حمد و نعت سے لے کر منقبت، سلام، مرثیہ، رباعیات، قطعات اور مختلف موضوعات کی نظمیں شامل ہیں۔ اگرچہ اس مجموعے میں غزل شامل نہیں، لیکن نظم اور دیگر اصناف میں انہوں نے ایسا کمال دکھایا ہے جو کسی بھی بڑے شاعر کے ہاں ملتا ہے۔

خورشید سہارنپوری کی شاعری کی اساس دین، اخلاق اور روحانیت پر ہے۔ ان کی نظموں میں خدا کی عظمت، نبی کریم ﷺ کی مدحت، اہلِ بیتؑ کی عظمت اور شہدائے کربلا کی قربانیاں نمایاں ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو صرف جذباتی اظہار تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس کے ذریعے سماج کی اصلاح اور امت کو بیداری کا پیغام بھی دیتے ہیں۔

ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تمام اصناف کو رواں اور سہل زبان میں برتا ہے۔ ان کے اشعار میں روانی اور سلاست، سوز اور وجدانی کیفیت، منظر نگاری اور علامتی پیرایہ، صوتی آہنگ اور قافیہ بندی کی خوش آہنگی پائی جاتی ہے۔

خورشید سہارنپوری کا اسلوب نہ تو محض کلاسیکی تقلید ہے اور نہ ہی خالص جدت پسندی۔ وہ روایت اور جدت کے سنگم پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں قدیم اردو کے سادہ

الفاظ، فارسی تراکیب اور جدید احساسات سب یکجا ہیں۔ یہی امتزاج ان کے اسلوب کو جداگانہ پہچان عطا کرتا ہے۔

خورشید حسن خورشید سہارنپوری کا کلام ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ اردو شاعری کے خزانے میں وہ ایک ایسا چراغ ہیں جس نے اپنے دور میں ہی نہیں بلکہ آنے والے وقتوں کے لیے بھی روشنی فراہم کی۔ اگر ان کا کلام باقاعدہ تحقیق و تنقید کے ساتھ پیش کیا جائے تو اردو ادب کی تاریخ میں ان کا مقام مزید واضح اور مستحکم ہو گا۔

تجلیاتِ خورشید محض ایک شعری مجموعہ نہیں بلکہ ایک فکری و روحانی سرمایہ ہے۔ اس میں ایمان کی حرارت، عشقِ رسول ﷺ کی شدت، کربلا کے سوز اور اصلاحِ معاشرہ کی دعوت یکجا ملتی ہے۔ خورشید سہارنپوری کی شاعری اردو ادب کے اس تسلسل کی ایک کڑی ہے جو حمدیہ و نعتیہ روایت سے جڑ کر عشق ووفا، صبر و قربانی اور سوز و گداز کے نئے باب رقم کرتی ہے۔

نوٹ:(اگر خورشید حسن خورشیدؔ سہارن پوری کا گم شدہ کلام مل جائے تو ان کی مہارتِ تامہ اور اسلوب کی انفرادیت، اندازِ بیاں کی بو قلمونی واضح ہو اور نجانے کون کون سی نئی نئی باتیں سامنے آئیں)

شعبان جھلن شعبان، رحیم یار خان

0300-9671265

حسنِ ترتیب

نمبر شمار	نظم کا عنوان	صفحہ نمبر
۱	حمد	37
۲	حمد	39
۳	نعت شریف	40
۴	نعت شریف	42
۵	نعت شریف	44
۶	نعت شریف	46
۷	نعت شریف	49
۸	نعت شریف	54
۹	نعت شریف	59
۱۰	نعت (مخمس)	63
۱۱	مناجات	65
۱۲	معجزۂ معراج	71
۱۳	سلام	74
۱۴	سلام	77
۱۵	خدا سے التجا	80
۱۶	دیباچہ	82

۱۷	در منقبت مرشدنا بہاؤالدین شاہ مع	86
۱۸	نظم	88
۱۹	سیہ مستی ٔ برشکال	92
۲۰	کشمیر	94
۲۱	کشمیر تو کشمیر تھا	96
۲۲	شب ِبرات	98
۲۳	مرثیہ	100
۲۴	اذانِ سحر	102
۲۵	روز سیاہ	104
۲۶	دعائے اجتماعِ ملت	106
۲۷	سرحدِ آزاد	109
۲۸	وحدتِ اسلامی	111
۲۹	دہریت	116
۳۰	یاسیات	118
۳۱	شہیدِ سیاست	120
۳۲	پیغام	123
۳۳	قربانیوں کی عید	125
۳۴	شامِ عید	127

۳۵	نادانیٔ مسلم	129
۳۶	لیگ	131
۳۷	بیان کی حقیقت	134
۳۸	ساقی نامہ	136
۳۹	مشقِ ستم	138
۴۰	طبِ قدیم	140
۴۱	خدا کے واسطے اک بار اور نام کرو (ایڈیٹوریل نظم)	142
۴۲	دنیا	152
۴۳	جھولنا	154
۴۴	مخمس	157
۴۵	اظہارِ فنا	161
۴۶	تلاشِ یار	167
۴۷	تصوراتِ جمال	172
۴۸	چاند کی سیر	176
۴۹	ایک حسینہ پر نظر	185
۵۰	ناکامی وکامیابی	190
۵۱	قصیدہ یادِ رفتگاں شکوۂ دورِ زماں	193
۵۲	قائداعظم	206

۵۳	دعا کی نذر	207
۵۴	داتا گنج بخش	208
۵۵	پیامِ خورشید	213
۵۶	ابرِ بہار آجا	216
۵۷	سہرا	221
۵۸	سہرا	223
۵۹	سہرا	224
۶۰	تصویرِ غم	225
۶۱	رعبایات	242
۶۲	قطعات	266

حمد

وہ جو ٹوٹی ہوئی کشتی بھنور میں تھام لیتا ہے
وہ جس کا ناخدا طوفاں میں گھر کر نام لیتا ہے

بیاضِ صبح جس کے عارضِ تاباں سے وابستہ
وہ مشرق جس کی زلفوں سے سوادِ شام لیتا ہے

وہ ایک نقشِ حسیں جو کھینچ نہیں سکتا تصور سے
جو ہنگامِ نظر رنگینیٔ اوہام لیتا ہے

خودی ناکام کو نا آشنائے راز رکھتا ہے
مئے عرفاں کا جو بے خود کی خاطر جام لیتا ہے

ٹپک جاتے ہیں سازِ غم سے بھی نغمے طرب افزا
ذرا مطربِ رحمت سے وہ جس دم کام لیتا ہے

شکستہ خاطروں کی کاوشِ پیہم مٹانے کو
وہ جو ٹوٹی ہوئی منزل پۂ آرام لیتا ہے

وہ رنگِ ابتدا میں حسن بے تمثال کی صورت
خراب جلوہ جس سے عشق بے انجام لیتا ہے
(نوٹ: مصرع اولیٰ میں "کی صورت" کہ جگہ "کی حیرت" بھی رقم ہے)

وہ جو بنتا ہے مونس آشیانہ جلنے والوں کا
اسیروں کی خبر جو آ کے زیرِ دام لیتا ہے

وہ آ ملتا ہے دشت آوارگانِ نا امیدی میں
وہ چشمِ یاس سے جو دید کا پیغام لیتا ہے

وہ کوہِ طور پر جو برق بن کر خود چمک اٹھا
وہ وقتِ دید جاں سوزی کا جو الزام لیتا ہے

وہی مولا ہے میرا جس کی درگاہِ عطوفت سے
دعائے عام پر خورشیدؔ خاص انعام لیتا ہے

حمد

حمدِ خالق میں قلم نے یہ زباں پائی ہے
خشک لکڑی میں بھی کیا طاقتِ گویائی ہے

کیا نگاہِ غلط انداز کی چترائی ہے
سات پردوں میں بھی بیٹھی ہوئی ہرجائی ہے

وصفِ قامت میں قلم نے وہ دکھائی صفت
شاخِ طوبیٰ میرے مصرعے سے نکل آئی ہے

عارضِ گل ہے تو ہی دیدۂ بلبل ہے تو ہی
خود تو ہی حسن بھی ہے خود ہی تماشائی ہے

عیب کو حسن بنا دے وہ تری قدرت ہے
موتیا دیدۂ گلزار کی بینائی ہے

وصفِ معمارِ ازل کا نہیں ممکن خورشیدؔ
دستِ قدرت کی صفا گنبدِ مینائی ہے

نعت شریف

عرش بنا ہے فرش بنا ہے جس سے وہ ساماں تم ہی تو ہو
شافعِ محشر، دلبرِ دوار، باعثِ دوراں تم ہی تو ہو

حسنِ حسیناں تم ہی تو ہو، رشکِ مہِ کنعاں تم ہی تو ہو
دستِ ذلیخا جس پہ بڑھا، وہ حسن بد اماں تم ہی تو ہو

سارے رسولوں میں ہو مکرم فخرِ عالم باعث آدمؑ
کشتی والے نوحؑ تم ہی ہو، باعثِ طوفاں تم ہی تو ہو

آپ کے کاکل غیرتِ سنبل، آپ کے عارض روحِ صد گل
نور کے پیکر مہرِ منور، جان حسیناں تم ہی تو ہو

نغمے ہیں داؤد کے پیارے جن میں گن گائے ہیں تمھارے
طور بد اماں ذوقِ نگاہِ موسیٰ عمراں تم ہی تو ہو

ہم پہ تمھارے کتنے ہیں احساں، تم نے دیا ہے ہم کو قرآں
دین و یقینِ قلبِ مسلماں، قبلۂ ایماں تم ہی تو ہو

احمد پیارے راج دلارے گائیں نہ ہم کیوں سہرے تمھارے
دولہا شبِ اسریٰ کے تم ہو، نوشہِ ذیشاں تم ہی تو ہو

دردِ فرقت میرا کلیجا، میرا دل اور عشق تمھارا
نور کی محفل پہلو میں ہے جس میں نمایاں تم ہی تو ہو

مالکِ یثرب والئ بطحا، صاحبِ قوسین واوَ ادنیٰ
قمرئ سدرہ جس پہ فدا وہ سروِ خراماں تم ہی تو ہو

جس کے شجر صدیق و عمر ہیں، حیدر و عثماں جس کے ثمر ہیں
پھول جہاں شبیر و شبر ہیں، وہ گلستاں تم ہی تو ہو

حسنِ یوسف عشقِ زلیخا تم، ید بیضا تم دم عیسیٰ
جانِ عالم جانِ جہاں خورشیدؔ کے جاناں تم ہی تو ہو

نعت شریف

پہنچے جو محبت میں، آزار تو ایسے ہوں
عیسیٰ سے نہ ہوں اچھے، بیمار تو ایسے ہوں

دوزخ میں قدم رنجہ فرمایا خدا نے خود
محبوب کی امت پر ہوں، پیار تو ایسے ہوں

صدیق محبت میں، خوش غارِ ستم زا میں
شیدائے چہِ غنجب، ہوں یار تو ایسے ہوں

سینہ میں محبت کے داغوں کی بہار آئی
ہر گل میں ہے بو ان کی، گلزار تو ایسے ہوں

قربت کا تقاضا تھا معراج میں ہر لحظہ!
موسیٰ سے یہ کہہ دیجیو، دیدار تو ایسے ہوں

بخشش نے شفاعت کا جھکنے نہ دیا پلّا
احسان کسی پر ہوں، ہر بار تو ایسے ہوں

زخمی ہوں مرا سینہ، ٹکڑے ہوں جگر کے بھی
اے تیغِ نظر ہم پر، ہوں وار تو ایسے ہوں

کالوں نے قدم چومے، تھے غار میں آ آ کر
شیدا ترے ہوں زلفِ خم دار تو ایسے ہوں

اے طور جھکا چوٹی فاران کے قدموں پر
جلوہ گہ ناوش ہوں، کہسار تو ایسے ہوں

نعت شریف

ترے جلووں سے نظریں جھک گئیں صلِّ علیٰ کہہ کر
کبھی شمس الضحیٰ کہہ کر کبھی بدر الدجیٰ کہہ کر

سفینہ موج سے ٹکرانے والے بحرِ الفت کے
بلا لیتے ہیں طوفاں میں خدا کو نا خدا کہہ کر

مغنی چھیڑ دے وحدت کی لے سازِ انا الحق
خدا کا نام ہم لیتے ہیں محبوبِ خدا کہہ کر

ازل سے تا ابد لولاک کی تفسیر کرتے ہیں
انھیں کو ابتدا کہہ کر انھیں کو انتہا کہہ کر

شبِ اسریٰ بنایا تھا تمھیں کو مقتدا سب نے
پئے ختمِ نبوت پیشوائے انبیاء کہہ کر

یہ کہنا حد سے گزری ہے ہماری چاک دامنی
سلامِ عاجزانہ گل سے اے باد صبا کہہ کر

جمالِ یثربی اللہ اکبر حضرتِ یوسف
کلیجے کو پکڑ کر رہ گئے یا مصطفیٰ کہہ کر

تمھارا در اگر چھوڑوں تو پھر آخر کہاں جاؤں
تمھیں حاجت روا کہہ کر تمھیں مشکل کشا کہہ کر

مئے صافی میری مینا میں ہے خورشید کچھ ایسی
کہ جس کو پینے والے پیتے ہیں خذما صفا کہہ کر

نعت شریف

جگر جلے ہے تو جاں بھی کباب ہوتی ہے
گھڑی فراق کی ہر اک عذاب ہوتی ہے

وہ بارگاہِ رسالت مآب ہوتی ہے
کہ جس کی کاہکشاں اک طناب ہوتی ہے

ستارے بنتے ہیں شب بھر تو نور چھن چھن کر
سحر کو وا ترے رخ سے نقاب ہوتی ہے

کہا ہلال نے جس دم چلے سوارِ براق
عیاں فلک پہ کسی کی رکاب ہوتی ہے

عرق کی پھیل کے خوشبو صبا کے دامن پر
کہیں ہے مشک کسی جا گلاب ہوتی ہے

بنے ہے دیدۂ حورانِ خلد کا سُرمہ
جو کوئے یار میں مٹی خراب ہوتی ہے

ضیائے روئے منور کو دیکھیے دن رات
کبھی ہے ماہ کبھی آفتاب ہوتی ہے

کہا چٹک کے کلی نے چمن میں صلِّ علیٰ
وہ کون ہم میں دہن کا جواب ہوتی ہے

رسیلی آنکھ میں سرخی سی جب جھلکتی ہے
مے طہور پہ چشمِ عتاب ہوتی ہے

وہ حسن تاک لیا جس کو چاہتا ہے خدا
یہ آنکھ نذر نگاہِ صواب ہوتی ہے

مدد کو آیئے جلدی سے یا رسول اللہ
فشارِ قبر سے حالت خراب ہوتی ہے

تم ہی پہ نقد دل و جاں نثار کر دوں گا
متاعِ عشق جو یوں دستیاب ہوتی ہے

لکھی ہے نعت جو خورشیدؔ نے خدا جانے
جواب رکھتی ہے یا لاجواب ہوتی ہے

نعت شریف

پہلے خونِ تمنا سے تو کر وضو
پھر صلوۃِ محبت میں ہو قبلہ رو
جلوۂ یار کی دل میں کر جستجو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

پھر نگاہوں سے اغیار کی بچ کے چل
کوچۂ یار سے غیر بن کر نکل
رکھ بظاہر حجابِ دوئی رو برو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

یہ فریبِ محبت کی بیدار ہے
حسن کب عشق والوں سے نا شاد ہے
اے مغنی بجا ساز لا تقنطو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

جلوۂ یار کی یاد دن رات ہے
دوستو! یہ مرے دیس کی بات ہے
یاد ہیں جلوہ ہائے لبِ آبجو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

شرط الفت نہیں شاداں زلتیں
باید اندر علم با فغاں زلتیں
قطرۂ اشک میں آ کے دل کا لہو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

عاجزی تیرے چہرے سے بیدار ہے
بے کسی بے بسی کچھ ہوئی دار ہے
یہ سمجھ زیرِ خنجر ہے تیرا گلو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

تیرے جلووٴں کی تفسیر ممکن نہیں
تیری صورت کی تصویر ممکن نہیں
تیرے مانند کب ہوے کوئی خوب رو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

آرزو ہائے دیدار بے جا سہی
درد کا اور ہی کچھ مداوا سہی
اے حسیں تجھ پہ روشن ہے الفت کے خو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

تیرے در تک پہنچنے میں وسواس ہے
خام کارئ الفت کا احساس ہے
منفعل کر رہی ہے تری آرزو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

اے خیالِ جمال الحذر الحذر
عشوۂ دل نوازی بھی ہے پرخطر
وہ حنا میں ملاتے ہیں میرا لہو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

ہیں نگاہوں کے ناوک بہت کام کے
ہیں فدا چشمِ کافر کے انعام کے
لب ہیں زخمِ جگر نا سزائے رفو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

تیرے کوچے میں آئے وہ بد نام کچھ
جن پہ نہیں بد نگاہی کے الزام کچھ
ہے نگاہوں میں تو لب پہ تو دل میں تو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

ہو گیا جب سفینہ بھنور آشنا
بے کسی میں ہوئے نا خدا سب جدا
آ گیا بحرِ امداد طوفاں میں تو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

بال الجھے ہوئے دام انداز سے
خود دکھانے لگے ہیں وہ اب ناز سے
دل کی خورشیدؔ بر آئی کچھ آرزو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

نعت شریف

وہ بندہ خدائی کا مختار آیا
کہ جس پر خدا کو بھی خود پیار آیا
گرا دینے یوسف کا بازار آیا
دکھا دینے وہ اپنا دیدار آیا
جما دینے پھر رنگِ گل زار آیا

(بند کے آخری مصرع میں "جما دینے" کے ساتھ "بڑھا دینے" بھی رقم ہے۔)

سرِ حشر مجبور و ناچار آیا
ندامت پریشاں گناہ گار آیا
بہ لب نا لہائے شرر بار آیا
قیامت کا جب گرم بازار آیا
نظر وہ شفاعت کا مختار آیا

نگاہیں الجھنے لگی یاسمن سے
تجسس ہے رخسار کا نسترن سے
بتاتے ہیں کچھ راز غنچے دہن سے
ہے نرگس کو رنگیں سی نسبت چمن سے
یہاں بھی تمھارا ہی بیمار آیا

وہ گرم آنسو اور چشمِ پرنم کی آتش
وہ دل اور وہ سوزِ پیہم کی آتش
کچھ اس طرح بھڑکی ہے پھر غم کی آتش
بجھی جا رہی ہے جہنم کی آتش
محمدؐ کا شاید گناہ گار آیا

کچھ ایسے ہوئے ہیں بہم داغ دل پر
مٹانے سے ہوں گے نہ کم داغ دل پر
بہت کر رہے ہیں ستم داغ دل پر
فغاں لب پہ آنکھوں میں نم داغ دل پر
ہر اک تیری الفت میں سر شار آیا

بسا ہے نگاہوں میں صحرائے وحشت
ہے رنگیں وفورِ تماشائے وحشت
نیازِ خمہ سازِ غم پائے وحشت
ادب کوش بن دشتِ پیمائے وحشت
شہنشاہِ یثرب کا در بار آیا

دو عالم کا سلطاں مگر ہاتھ خالی
وہ فخر رسل اپنے رتبہ میں عالی
وہ حسن اس کا پیارا ادائیں نرالی
وہ کوثر کا ساقی وی جنت کا والی
مدد لینے والو! مدد گار آیا

محبت کا دل میں بھرتی ہے وفا رنگ
یہ شیشہ نہیں رکھتا اب بد نما رنگ
دو عالم پہ آج ہے صلی علیٰ رنگ
گلستاں کے پھولوں پہ چھڑکا گیا رنگ
حسینوں کا پھر روزِ بازار آیا

رہے گا سدا کون عالم میں باقی
کیا آج قسمت نے تجھ سے ملاقی
یہ جلوہ اچانک یہ بزمِ السقاقی
لگا لینے دے جام ہونٹوں سے ساقی
تری چشمِ میگوں پہ پھر پیار آیا

مری بے خودی ہوشیاری سے اعلیٰ
مرا کیف ہے مے کشوں میں نرالا
مری معصیت بن گئی جان تقویٰ
مرا ذوقِ مے کتنا پاکیزہ نکلا
سرور آیا جب لب پہ غفار آیا

مری معصیت بن گئی دل لگی سی
گناہوں پہ چھائی ہے رحمت کسی کی
سمجھیے نہ یوسف کی اس کو کہانی
بکِے کھوٹے داموں یہ حلنس معاصی
یہ ممکن نہیں جب خریدار آیا

ترے در پر آیا ہے خورشیدؔ تیرا
برا یا کہ اچھا ہے خورشیدؔ تیرا
لیے سر میں سودا ہے خورشیدؔ تیرا
شہیدِ تمنا ہے خورشیدؔ تیرا
دکھا رخ کہ جلوہ طلب گار آیا

نعت شریف

چھیڑ وحدت کا کوئی ساز مدینے والے
کر دے مستِ مئے آواز مدینے والے
پھر دکھا حسن کا اعجاز مدینے والے
ہم اٹھائیں گے ترے ناز مدینے والے
حسن و الفت کے کھلے راز مدینے والے

اب پلانے کی طرف دھیان نہ پینے کی طرف
درد کچھ دل میں ہے سوز ہے کچھ سینے کی طرف
تیرے مہجور کی رغبت نہیں جینے کی طرف
جی میں آتا ہے کہ اڑ جاؤں مدینے کی طرف
دے مجھے طاقتِ پرواز مدینے والے

عرش پر تجھ کو بلایا ہے ضیافت کے لیے
آئے جبریل ادب سے تری دعوت کے لیے
خوب ہی تو نے مزے حسن و محبت کے لیے
تجھ سا محبوب نہ تھا بزمِ حقیقت کے لیے
کھل گیا تجھ پہ ہر اک راز مدینے والے

شمع کی طرح ہوا سوز نمایاں دل میں
اب بھڑک اٹھی ہے جو آگ تھی پنہاں دل میں
دیکھ لے تو بھی تڑپتے ہوئے ارماں دل میں
کافرِ عشق ہوں باقی نہیں ارماں دل میں
دل کی جانب نگہٗ ناز مدینے والے

دل میں تو اور مرے سر میں ترا سودا ہو
وہ گھڑی آئے مری آنکھ ترا جلوا ہو
نگہٗ شوق مری اور ترا روضہ ہو
جنبشِ تارِ رگِ جاں میں تیرا نغمہ ہو
بربطِ دل ہو تیرا ساز مدینے والے

گام فرسائی میں ہیں خارِ بیاباں دشمن
زخم دل کے ہوئے جاتے ہیں نمکداں دشمن
فکر میں ہے تری امت کی سب ایماں دشمن
لشکرِ کفر ہے سارا بہ دل و جاں دشمن
ہیں کہاں اب تیرے جانباز مدینے والے

آج وہ بادہ پلا پینا ہوا جس کا حلال
آج دھل جائے مرے دل سے ہر اک گرد ملال
آج للہ دکھا دے رخِ انور کا جمال
ادبِ عشق تو ہوتا ہے بہت ضبط مآل
اشکِ غم بنتے ہیں غماز مدینے والے

واہ کس شان کا ہے صلِ علیٰ یہ روضہ
دیدِ کا حور و پری کو بھی ہے جس کی سودا
اس سے بہتر نہیں رکھتی کوئی فرماں دنیا
دیکھ کر خلد کو خورشیدؔ بھی یوں کہنے لگا
تیرے روضے کا ہے انداز مدینے والے

نعت

فلک کے اوج کی مٹی خراب ہوتی ہے
گلی حضور کی گردوں جواب ہوتی ہے
زمین روضہ کی جنت جناب ہوتی ہے
وہ بارگاہِ رسالت مآب ہوتی ہے
کہ جس کی کہکشاں ہی اک طناب ہوتی ہے

کہاں سحر شبِ فرقت شتاب ہوتی ہے
یہ رات حشر کے دن کا جواب ہوتی ہے
ہمارے دل میں خلش بے حساب ہوتی ہے
گھڑی فراق کی ہر اک عذاب ہوتی ہے
جگر جلے ہے تو جاں بھی کباب ہوتی ہے

ہوا ہے نور کا گویا ظہور چھن چھن کر

صفا جمال میں آئی حضور چن چن کر

ضیائے حسن گئی دور دور چھن چھن کر

ستارے بنتے ہیں شب بھر تو نور چھن چھن کر

وا جب تیرے رخ سے نقاب ہوتی ہے

مناجات

درد مندوں کے آقا مجھے بھیک دے
مست مندوں کے مولا مجھے بھیک دے
اے شہنشاہِ بطحا مجھے بھیک دے
اے سخاوت کے دریا مجھے بھیک دے
رونقِ بزمِ اقصیٰ مجھے بھیک دے

شامِ اقصیٰ کے دولہا مجھے بھیک دے
سہرا گاتا ہوں تیرا مجھے بھیک دے
اے حسینوں میں اعلیٰ مجھے بھیک دے
اے مرے سروِ بالا مجھے بھیک دے
اے شہنشاہِ والا مجھے بھیک دے

چھا گیا ہے اندھیرا مجھے بھیک دے
آ گئی شامِ یلدا مجھے بھیک دے
آج ہے زورِ سودا مجھے بھیک دے
کالی زلفوں کا صدقہ مجھے بھیک دے
اے سخاوت سراپا مجھے بھیک دے

شام بھیگی ہوئی عطر میں آ گئی
رات بن کر دلہن شام پر چھا گئی
موتیوں کی طرح تارے برسا گئی
جب سواری تری سوئے اقصیٰ گئی
شاہدِ حق تعالیٰ مجھے بھیک دے

اب کے جرعۂ راحت انجام دے
اب صبوحی نہیں بادۂ شام دے
آج تو جام بادۂ گلفام دے
پھر سکوں کا مرے دل کو پیغام دے
لا اٹھا جام و مینا مجھے بھیک دے

دیکھیے رنجِ پیہم کی جولانیاں
دردِ دل سے ہیں کیا کیا پریشانیاں
کلفتوں میں ہیں ہر دم فراوانیاں
چرخ کرنے لگا فتنہ سامانیاں
چاہیے کچھ مداوا مجھے بھیک دے

کیوں بھنور میں سفینہ ہمارا نہیں
کیا بہت دور ہم سے کنارا نہیں
جز ترے اب کوئی بھی سہارا نہیں
ناخدائی کی دے بھیک چارا نہیں
اب لگا پار نیّا مجھے بھیک دے

جب خطا پوش تو ہے خدا کی قسم
کالی کملی کو پھیلا برائے کرم
میرے عیبوں کو ڈھک لے جمیلُ الشِّیَم
اب بھکاری شفاعت کے ہیں تجھ سے ہم
ڈال عصیاں پہ پردا مجھے بھیک دے

دل سے جاتا نہیں معصیت کا اثر
ہے حسینانِ بت خانہ پر نظر
گامزن پھر ہوں میں دیر کی راہ پر
ہے امیدِ کرم اب بھی تجھی سے مگر
اب جمال اپنا دکھلا مجھے بھیک دے

روزِ وحشت بھی کچھ چارہ کرتا نہیں
جیب و دامن کو صد پارہ کرتا نہیں
میں نگاہوں کو آوارہ کرتا نہیں
چشمِ نرگس کا نظارہ کرتا نہیں
اپنی نینوں کا صدقہ مجھے بھیک دے

بادۂ حسن سے حسن مدہوش ہے
چشمِ حق جامِ صہبائے سرجوش ہے
قابِ قوسین اک رمزِ آغوش ہے
عرش کے سر پہ اک کس کی پاپوش ہے
اپنی جوتی کا صدقہ مجھے بھیک دے

نعلِ پا سے ملی چشمِ توحید ہے
رات معراج کی عرش پر عید ہے
حسن سے عشق کو لطفِ امید ہے
اب بھکاری ترے در پہ خورشیدؔ ہے
وقت جلوہ کا آقا مجھے بھیک دے

معجزۂ معراج

نقشِ دوئی جہاں سے مٹاتا چلا گیا
تعمیر بت کدوں کی گراتا چلا گیا
آتش کدوں کی آگ بجھاتا چلا گیا
سجدہ میں سر بتوں کا جھکاتا چلا گیا
توحید کا سبق وہ پڑھاتا چلا گیا

ہر ہر قدم پہ برق گراتا چلا گیا
ہر نقشِ پا کو طور بناتا چلا گیا
سنگ و شجر میں آگ لگاتا چلا گیا
دشت و جبل کو سرمہ بناتا چلا گیا
دیپک وہ سازِ حسن پہ گاتا چلا گیا

رگ رگ میں مثلِ روح سماتا چلا گیا
جن و بشر کے دل کو لبھاتا چلا گیا
شمس و قمر کو رشک دلاتا چلا گیا
قوسین کی فضاؤں پہ چھاتا چلا گیا
حوروں کے دل پہ تیر چلاتا چلا گیا

معراج جس کو کہتے ہیں شکلِ وصال تھی
یہ رات نور کی تھی شب پُر جمال تھی
دل میں کوئی غبار نہ گردِ ملال تھی
روکے کوئی فلک پہ یہ کس کی مجال تھی
اپنے براق کو وہ بڑھاتا چلا گیا

جنبش میں تھی جناب کی زنجیرِ در ابھی
انساں پہ تھا نہ جانے کا کوئی اثر ابھی
گرمیِ جسم پاک بھی تھی بیشتر ابھی
واپس فلک سے آگئے خیر البشر ابھی
روح الامیں خبر یہ سناتا چلا گیا

جبریل در پہ آئے ادب سے کیا سلام
معراج کی ہے رات دیا آپ کو پیام
فردوس آستانہ ہے کوثر تیرا مقام
بطحا کی سمت ہند سے لے کے تیرا نام
خورشدؔ تیری نعت میں گاتا چلا گیا

سلام

درِ رسولؐ کو رضواں سلام کہتے ہیں
تمام خلد کے رضواں سلام کہتے ہیں

نبیؐ ہیں تابعِ فرماں سلام کہتے ہیں
تمھیں کو موسیٰ عمراں سلام کہتے ہیں

ادب سے تھام کے زلفِ سیاہ کا دامن
سب اہلِ ظلمتِ عصیاں سلام کہتے ہیں

تمہارے رخ کو چمن کے ہوں پھول یا یوسف
ہیں جتنے چاک بداماں سلام کہتے ہیں

پڑی چمک شب اسریٰ جو ان کے عارض کی
کلیم طور پہ حیراں سلام کہتے ہیں

خدا نے آپ کو بدر الدجیٰ قرار دیا
اسی سبب مہِ کنعاں سلام کہتے ہیں

جنابِ نوحؑ کو طوفاں میں اضطراب سا ہے
تمہارے بندۂ احساں سلام کہتے ہیں

تمہاری ابروئے محراب وش کو دیکھ کے ہم
سمجھ کے قبلۂ ایماں سلام کہتے ہیں

تمہاری چشم گلابی وہ کیف پرور ہے
بہشت و کوثر و رضواں سلام کہتے ہیں

تمہاری زلف معنبر کا سب کو سودا ہے
فلک کے اہلِ شبستان سلام کہتے ہیں

بگولے دشت نوردوں کو تیرے اٹھ کر
بتا کے راہِ بیاباں سلام کہتے ہیں

تھکا ہے ناقۂ عمرِ رواں ہے منزل سخت
تجھی کو تیرے حُدی خواں سلام کہتے ہیں

دلائی یاد سرِ حشر ان کی زلف کی ہم
تجھی کو ناقۂ عصیاں سلام کہتے ہیں

نظر میں ہے گلِ عارض میں پا فگار نہیں
زباں سے خارِ مغلیاں سلام کہتے ہیں

رکے جو سدرہ پہ آئی ندائے پردۂ قدس
بڑھو کہ ہم تمہیں اے جاں سلام کہتے ہیں

ہم ان کو آیۂ لولاک کی جو روح بنے
خدا ہے جن کا ثنا خواں سلام کہتے ہیں

نہیں ہے خوف انہیں حشر میں گناہوں کا
تجھے جو رحمتِ یزداں سلام کہتے ہیں

مثالِ سرو اٹھو آج خاکِ مرقد سے
حضور بو ذر و سلماں سلام کہتے ہیں

سلام

ہو سلام ان پہ کہ ہم سر نہیں جن کا کوئی
سیدِ اہلِ جناں ان سا نہ ہو گا کوئی

اے شبِ قتلِ حسین ایسا اندھیرا کوئی
کیا تہہِ چرخ کہیں تو نے بھی دیکھا کوئی

شام میں کب ہوئی تجھ سی شبِ صحرا کوئی
تجھ سی کب آئی جہاں میں شبِ یلدا کوئی

بیبیاں روتی ہیں لاشوں پہ شہیدوں کی اگر
بانیٔ جور سمجھتے ہیں تماشا کوئی

چرخ سے بن نہ سکا پھر کوئی اکبرؑ سا جواں
خورد سالوں میں ہوئی پھر نہ سکینہؑ کوئی

ع خورد سالوں میں نہ پیدا ہوئی صغرا کوئی

(نوٹ: قلمی نسخے میں مصرع ثانی یوں بھی رقم ہے)

بے ردا اہلِ حرم لاشے کفن سے محروم
یا حسینؑ آپ سا مظلوم نہ ہو گا کوئی

لاش اکبرؑ کی جو دیکھی تو لگے کہنے حسینؑ
ہو سفر میں نہ جدا باپ سے بیٹا کوئی

شہ نے فرمایا کہ امت کے لیے کیجیے دعا
دل میں لانا نہ ملال اپنے سکینہؑ کوئی

رو کے سقائے حرم بولے کہ اے نہرِ فرات
تو نے بھی دیکھا ہے پیاسا کبھی مجھ سا کوئی

دیکھ کر لاشہِ قاسمؑ کی دلہن چیخ اٹھی
ہو نہ آلودۂ خوں یوں کبھی سہرا کوئی

شہر بانو نے کہا لاشہ سے رو کر ایسے
مسکرا دو تو نہیں اور تمنا کوئی

اشقیا کو بھی تھی اکبرؑ کی شجاعت تسلیم
یوں ہزاروں سے لڑا ہو گا نہ تنہا کوئی

گوہرِ اشک پرو تارِ نگاہِ غم میں
تا بنے قاسمِ نو شاہ کا سہرا کوئی

سانحہ غم کا یہ سننے کے لیے اے خورشیدؔ
چاہیے پہلو میں پتھر کا کلیجہ کوئی

خدا سے التجا

اے پردہ نشیں پردہ اٹھا جلوہ دکھا دے
بیماریٔ دل دیکھ تو لی اب تو دوا دے

یا تو اسے صیاد کی نظروں سے چھپا دے
یا شاخِ نشیمن پہ کوئی برق گرا دے

گم کردۂ پرواز کو مایوسِ قفس کر
صیاد کی خواہش ہے کہ کچھ اور سزا دے

ہر چند کے ہے نازشِ بے جا تجھے دنیا
کچھ رنگِ وفا اپنی جفاؤں میں ملا دے

جب دل میں اٹھے ہوک سی ہو ہو کہ جگر چاک
ڈر ہے کہیں تو ہاتھ نہ سینے سے اٹھا دے

شامِ شبِ فرقت سے ہے جو گوشۂ تاریک
اس میں رخِ زیبا سے حسیں شمع جلا دے

طوفاں ہے اندھیرا ہے شکستہ ہے سفینہ
اب تیرے سوا کون اسے پار لگا دے

محتاج نہیں بادِ صبا کا مرا مولا
وہ چاہے تو سوکھے ہوئے پھولوں کو کھلا دے

خورشیدؔ کھڑا ہے تری دیوار کے نیچے
آ بام پہ اور رخ سے نقاب اٹھا دے

دیباچہ

نام اللہ کا زبان سے لے
لذتِ بندگی بیان سے لے

چمنِ دہر کا وہ ہے مالی
اس کی تعظیم کو جھکی ڈالی

نخل و اکمام عصف و حب ریحان
مانتے ہیں اسی کو سب سبحان

نکہتیں دی وہ اس نے سنبل کو
شرم آ جائے جن سے کاکل کو

بوستان میں کھلی گلاب رہے
گلر خون کو ذرا حجاب رہے

سیب پیدا کیا چمن کے لیے
ناز اب کیا رہا ذقن کے لیے

ابھرے جوبن کی ابتدا دیکھو
باغ میں لیچیوں کو جا دیکھو

قد کا قصہ تمام ہوتا ہے
سرو کو جب قیام ہوتا ہے

رخِ گیستی کو پر بہار کیا
خطِ رخسار سبزہ زار کیا

سرو نے لی جو اٹھ کے انگڑائی
گئی خوش قسمتوں کی رعنائی

چشمِ فتاں پہ دعویٰ ہو جس کو
بوستاں میں وہ دیکھے نرگس کو

غنچہ سے تنگ ہے دہن کس کا
حمد سے خوب ہے سخن کس کا

برگ گل کی بھلا نزاکت کیا
قدرتیں ڈھا گئیں قیامت کیا

تیرا ثانی کہاں عدیل کہاں
تیرا ہمتا کہاں شبیل کہاں

غنچہ کیا چیز ہے گلاب ہے کون
منہ پہ ڈالے ہوئے نقاب ہے کون

دور عارض سے گر نقاب نہ ہو
نہ بنے یاسمن گلاب نہ ہو

آیتِ اولین خدا کی ہے
شانِ لولاک مصطفی کی ہے

تیرے احباب پر درود و سلام
تیری ازواج پر درود و سلام

تم سے بخشش کی بندھ گئی امید
آسرا تم سے رکھتا ہے خورشیدؔ

نذرِ عارض ہے یا شہِ اکرم
یہ کتابُ الحدائق عالم

(کتاب الحدائق جسے محمد قربان علی نے جنوری ۱۹۲۴ء میں شائع کیا
اس کا منظوم دیباچہ ہے)

در منقبت مرشدنا بہاؤالدین شاہ مع

درِ حضور پہ بہرِ سلام آتے ہیں
کرم کرم کے تمہارے غلام آتے ہیں

عطا عطا کے ترا سن کے نام آتے ہیں
سخا سخا کے بھکاری تمام آتے ہیں

مٹا دے ظلمتِ عصیاں تمام بدر الہند
سمجھ کے ہم تجھے ماہِ تمام آتے ہیں

ہے کاسہ ہاتھ میں جھولی بغل میں اے داتا
وہ بھیک دے جسے لینے غلام آتے ہیں

تمہارے عشق کی راہوں میں ہے فنا فی بقا
بتائیں کس سے کہ کیا کیا مقام آتے ہیں

تمہارے روضے کا شوقِ زیارت اتنا بڑھا
کہ مہر و ماہ ہر اک صبح و شام آتے ہیں

بنے ہیں رونقِ توحید تیری محفل میں
وہ بت جو کہتے ہوئے رام رام آتے ہیں

بہک رہے ہیں ترے در پہ بے خودانِ جمال
پیے ہوئے تری الفت کا جام آتے ہیں

تمہارے روضہ کو ہم مظہرِ جمالِ خدا
سمجھ کے صورتِ بیت الحرام آتے ہیں

تھکے ہوئے ہیں بہت آج عشق آوارہ
تمہارے در پہ برائے قیام آتے ہیں

ہماری آنکھ میں گھنے ہیں اشکِ غم خورشیدؔ
کہ نالے دل میں بھی ہم روک تھام آتے ہیں

نظم

خودی کو چھوڑ کے دل میں خدا کا دھیان لایا ہوں
وسیلہ سے تمہارے یا نبیؐ ایمان لایا ہوں

پرو کر سوزنِ تدبیر میں پھر رشتۂ ایماں
رفوئے چاکِ عصیاں کے لیے سامان لایا ہوں

سزا وارِ امانتِ عبدیت تھی عبدِ مومن کی
محمدؐ نے کہا تیرے لیے قرآن لایا ہوں

کدھر بیٹھا ہے بزمِ دھر میں مخمورِ برگشتہ
میں تیرے واسطے جامِ مئے عرفان لایا ہوں

متاعِ سطوت کبریٰ ہوئی گم شام عصیاں میں
تجسس کے لیے پھر مشعلِ ایمان لایا ہوں

مکمل جو کرے تعمیر ایثار و اخوت کی
وہی معمار لایا ہوں وہی قرآن لایا ہوں

بیاں منظور ہے کچھ قصۂ حسن و محبت کا
زباں پر اپنی نامِ بوذر و سلمان لایا ہوں

سمجھ لے عشق کی پاکیزگی ہے جلوہ قربانی
مسلماں تک حنین و بدر کا پیمان لایا ہوں

مسلماں یاد ہے کچھ تجھ کو عہدِ استوار اپنا
میں تیرے واسطے تیرا وہی پیمان لایا ہوں

دکھا دے شان اب پھر قرنِ اولیٰ کے مسلماں کی
بتا دے شرک پر شمشیر کی برہان لایا ہوں

ہوئی ہے سرد برقِ طورِ سینا روبرو جس کے
چراغِ نور میں تجھ سے وہ اے فاران لایا ہوں

خودی کھوکر تری محفل میں بن کر نغمہ آشفتہ
صدائے ساز کل و من علیہا فان لایا ہوں

حریمِ ناز میں پھر میں خراب جلوہ ہونے کو
دلِ آشفتہ لایا، دیدۂ حیران لایا ہوں

ہوئی جلوہ طلب گل سے مری خوں نابہ افشانی
جوازِ دید پر یعنی میں اک برہان لایا ہوں

بنائے ہر دو عالم ہوں وہ ہوں میں ذرۂ خاکی
میں گو ایک قطرہ ہوں آغوش میں طوفان لایا ہوں

تمنا اجتماعِ امتِ احمد کی پھر دل میں
مسلماں روبرو تیرے بصد ارمان لایا ہوں

کہ میرا جس کا پھیلا غرب سے تا شرق اے مسلم!
علم اسلام کا وہ پھر سرِ میدان لایا ہوں

وراثت عرض کی دیتا ہوا پھر آسماں بولا
عناک اللہ مسلم پھر میں تیرا دھیان لایا ہوں

مسلماں جمع مسلم لیگ کے جھنڈے تلے سب ہوں
میں اپنے قول پر قرّاہاں سے برہان لایا ہوں

حدیثِ دین و ملت میں جو رحمت ہے تری خاطر
پئے اقوام لایا ہوں پئے اوطان لایا ہوں

سمجھنے اور سمجھانے کی باتیں ہیں حقیقت میں
نہ میں کچھ لے چلا ہوں اور نہ اے نادان لایا ہوں

جزاک اللہ اک دو گام ہمت اور اے مسلم!
تجھے میں غزلوں سے سوئے پاکستان لایا ہوں

سیہ مستیٔ برشکال

وہ اٹھی کالی گھٹا ابرِ سیاہ چھانے لگا
مطلعٔ مشرق سے پیغامِ سرور آنے لگا

تارِ قطراتِ رواں کے ساز پر مستانہ وار
ہمرہٗ رقاصۂ برق آسماں گانے لگا

اٹھ کے ہر ایک ابر پارہ ہو کے مے خانہ بدوش
اک سرورِ کیف زا ساحل پہ برسانے لگا

ظلمتِ عشرت قضا کی جلوہ کاری کے لیے
برق کا رنگیں فتیلہ کوئی اکسانے لگا

آج ہے گلشن میں پھر وہ مہر سامانِ نشاط
جو سرودِ رنگ و بو پھولوں پہ برسانے لگا

ذرہ ذرہ دیر کا موسیقیت آمادہ ہے
مطربِ فطرت وہ نغمے ساز پر لانے لگا

مٹ گئی تخیل کی تاریکیاں چمکی جو برق
عشوہ وقتِ تبسم ان کا یاد آنے لگا

وادیوں میں، سبزہ زاروں میں، چمن میں، کوہ میں
ابر پیغامِ حیاتِ تازہ پہنچانے لگا

غیر ذی زرع زمینوں پر ہے زر پاشی سے کام
دامنِ ابرِ سیاہ گوہر سے برسانے لگا

کھیلنے پانی سے آئے ہیں پری وش ماہ رو
لا کے ساقی اب کنارے رود مے خانے لگا

ابر کا دن ساقی و مے مطرب و چنگ و رباب
بن کے ہر اک رہزن تمکین و ہوش آنے لگا

برق چمکی رعد گرجا ابر چھایا ہر طرف
کوئی توبہ توڑنے پر دل کو بہکانے لگا

جادۂ دشتِ جنوں خورشیدؔ ہے زلفِ عروس
پھر ہر اک وحشی بیاباں کی طرف جانے لگا

کشمیر

کشمیر اگر ہاتھوں سے گیا انجام مسلماں کیا ہو گا
تو ہی بتا پھر کام تیرا اے گردشِ دوراں کیا ہو گا

کشمیر کی پریاں جب نہ رہیں، یہ ملک پرستاں کیا ہو گا
خوش منظر وادی کیا ہو گی سر سبز کوہستاں کیا ہو گا

جب پھوٹ چکے ہوں دل کے پھپولے، ٹوٹ چکے ہوں دستِ جنوں
پھر جیب کے پرزے کیا ہوں گے، پھر چاک گریباں کیا ہو گا

آنے کی نہیں جب فصل گل، چلنے کی نہیں جب بادِ صبا
زینت کے لیے پھر دام و قفس کی آخر ساماں کیا ہو گا

دل جل کے ہوا خاکستر لب خشک ہوئے آنکھیں سوکھی
اب دیدہ گریاں کیا ہو گا، اب رونے کا ساماں کیا ہو گا

جب پھوٹتی شاخیں جل جائیں، جب کھلتی کلیاں مرجھائیں
آغازِ گلستاں کیا ہو گا، انجامِ بہاراں کیا ہو گا

گھر بار جو ہوتا راج ترا ہر ملک سے ہو اخراج ترا
ہو غیر کے سر پر تاج تیرا پھر مسلمِ ناداں کیا ہو گا

خاموش کھڑی ہے اب بھی تو پامال ہوئی کشتِ لبِ جو
جب ہم نہ رہے پھر گیت ترا اے دخترِ دہقاں کیا ہو گا

جنت کے مکینوں پر یا رب! دوزخ کے شعلے لپکے ہیں
جب کفر کی ظلمت چھائے گی پھر نورِ ایماں کیا ہو گا

اے حسنِ رخِ جاناناں بتا اک دل کے لیے اتنے جلوے
تفریق کی صورت کیا ہو گی تقسیم کا ساماں کیا ہو گا

اجڑی ہے ادب کی ہر محفل بے چین ہوا شاعر کا دل
افسوس ان آخر لمحوں میں خورشیدؔ غزل خواں کیا ہو گا

کشمیر تو کشمیر تھا

میں سن تو رہا ہوں گریاں سا میں پڑھ تو رہا ہوں حیراں سا
کچھ ٹوٹا ٹوٹا قصہ سا کچھ مٹتا مٹتا عنواں سا

کشمیر کی وادی وہ وادی، جو وادی وادیٔ جنت تھی
کافر بھی جہاں کا اپنی ادا میں تھا اک مرد مسلماں سا

گرداب میں ڈوبا کھا کے جھکولے ہائے سفینہ ہستی کا
رب موت وہاں اک دریا ہے، بربادی ہے اک طوفاں سا

اس باغ میں وحشی آتے ہیں کلیوں کو مسلتے جاتے ہیں
ہر غنچہ دل کا پھپولا سا، ہر پھول ہے زخم نمایاں سا

اس دور کا انساں کیسا ہے، اس دور کی انسانیت سے
ہے عصمت چاک گریباں سی، ہے حسن دریدہ داماں سا

تن اجلا ہے من میلا ہے، یہ شور جہاں میں پھیلا ہے
سیرت میں جفا جو حیواں سا، صورت میں ستم گر انساں سا

اب ان کو جلایا جاتا ہے، جو دل کی اگ بجھاتے تھے
یہ انساں کی تصویر کا ہے، پس منظر عریاں عریاں سا

ہستی کے ابھرتے شعلوں پر تلوار کا پانی پھرتا ہے
کچھ آفت ظاہر ظاہر سی، کچھ امن ہے پنہا پنہاں سا

کشمیر کی پریوں کو دیکھو تصویریں ہیں یہ عبرت کی
کچھ حیراں حیراں یزداں سا، کچھ ہنستا ہنستا شیطاں سا

روتی ہے سحر کشمیر کی اب، کچھ شبنم سے کچھ بادل سے
ہر بوند ہے اک چنگاری سی ہر قطرہ شعلہ بداماں سا

خورشیدؔ جو وادی جنت تھی اس دور میں اس کی صورت ہے
اک بکھری بکھری حسرت سی، اک سمٹا سمٹا ارماں سا

شبِ برات

شبِ برات ہے لطفِ خدا ہے آج کی رات
فلک سے نور برسنے لگا ہے آج کی رات

خرابِ جلوہ نگاہیں پکار اٹھی ہیں
کوئی ستاروں کے پیچھے کھڑا ہے آج کی رات

کلی کلی میں چٹک ہے، چمن چمن میں مہک
زباں پہ غنچوں کی صل علیٰ ہے آج کی رات

فلک کا چاند ہے عریاں سمن بروں کی طرح
حریمِ قدس کا پردہ اٹھا ہے آج کی رات

ستارے بن کے ثریا جبیں نکل آئے
نگاہِ عشق کو لطف آ گیا ہے آج کی رات

مئے طہور کا ہے دور بزمِ پرویں میں
قمر کی چال بھی مستی نما ہے آج کی رات

صلائے عام ہے رندوں کو بزمِ ساقی میں
کہ خوب مانگ لیں جو مانگنا ہے آج کی رات

سرِ بقعات فلک کے حسین ہیں جلوہ فروش
وصال جس کا خود مدعا ہے آج کی رات

یہ کہہ رہے ہیں وہ خود مائلِ کرم ہو کر
بھکاریوں کا بھی رتبہ بڑا ہے آج کی رات

کسی کے حسن کی شوخی سے کوئی کہہ دیجیو
میری نظر کی بھی کچھ التجا ہے آج رات

مریضِ غم جو ہیں خورشیدؔ ان سے کہہ دینا
کہ حسنِ یار مسیحا بنا ہے آج کی رات

مرثیہ

لہو ہے دل کا میں لالہ فام تیرے بعد
جگر کے زخم کی صورت ہے جام تیرے بعد

عجیب سا ہے ہمارا مقام تیرے بعد
بدل گئی ہے ہر اک صبح و شام تیرے بعد

ڈھلک رہے ہیں جو پتھر سے آب شاروں میں
مری حیات کا ہے یہ نظام تیرے بعد

اٹک رہا سا ہوں موجوں پہ بحرِ ہستی کی
سفر سفر ہے نہ میرا قیام تیرے بعد

نمازِ عشق میں میں رو بہ قبلہ کیوں کر ہوں
نہ قبلہ میرا نہ کوئی مقام تیرے بعد

مری حیات کے ہر اک موڑ پہ تھے لالہ زار
خزاں کا ان کو بھی آیا پیام تیرے بعد

یہ ٹھنڈی سانسیں صبا کی چمن کے پھولوں کو
بتا رہی ہیں مگر تیرا نام تیرے بعد

کوئی یہ پوچھ تو دے جانے والے راہی سے
ہے میرے جینے کا کیا انتظام تیرے بعد

اثر ہے عشق کا، الفت کی نامرادی ہے
تری لحد پہ کریں ہم سلام تیرے بعد

مری نگاہ فلک کی طرف نہیں اٹھتی
اکیلا رہ گیا ماہِ تمام تیرے بعد

فلک کا جور بیاں کس سے ہم کریں خورشیدؔ
بچھا رہا ہے ستاروں کے دام تیرے بعد

اذانِ سحر

خاک ہوا تو غم نہ کر اس کو صبا سوار کر
گل کے جگر کو چاک دے لالہ کو داغ دار کر

شاخ فسردۂ خزاں رشتہ شجر کے ساتھ کر
ٹوٹ گئی اگر نہ پھر آرزوئے بہار کر

ربطِ حرم کو ہے دوام بادشاہی ہے چار دن
اس پہ نہ اعتماد کر اس پہ نہ اعتبار کر

کر کے زمینِ پست فکر و عمل پہ کشت زار
رفعتِ لالہ زار کو کوہ کی شرم سار کر

شب کی کدورتوں سے ہے صیقلِ نورِ آفتاب
آپ بھی تاب دار ہو، صبح کو بھی تاب دار رکھ

صوم و صلوۃ تک نہ پڑھ اپنے سلف کی داستاں
تیغ کو رکھ جگر گداز، تیر کو دل فگار کر

تو ہی بتا کہ اصل کیا دعوۂ بے دلیل کی
اہلِ جنوں کی رسم سیکھ جیب کو تار تار کر

شاد ہو اے شہیدِ ہند تو ہے ہمارا مہما
کہتے ہیں قتل گاہ میں ابنِ علی پکار کر

موت سے کر حذر نہ تو وصل کی ہے آرزو
کہنے لگا حباب جو سینہ و سر ابھار کر

کر نہ شکایتِ جفا حسن کی رسم ہے یہی
دل جو نثار ہو چکا جان بھی اب نثار کر

اہل صلوۃِ عشق کو میرا کلام ہے اذاں
خود بھی ہو سن کے ہوشیار اوروں کو ہوشیار کر

طایرِ بام کا پیام طایرِ زیرِ دام کو
اب نہ سنا سنا کے تو اور بھی بے قرار کر

روزِ سیاہ

اٹھایا جب مسلمانوں نے طاؤس و رباب آخر
افق میں آ گیا مغرب کے ان کا آفتاب آخر

تجھے کعبہ میں چھوڑا، غیر تھا چالاک خود بڑھ کر
ہوا داؤد کی آہن گری سے فیض یاب آخر

خدا کو نور کے پردہ میں دیکھا تو کیا دیکھا
اٹھایا تو نے عارض سے نہ ملت کے نقاب آخر

صدائے جاہدو آتی رہی یثرب کی جانب سے
مگر تو بن کے بیٹھا راہبِ ام الکتاب آخر

کوئی پوچھے کہستانِ عرب کے شاہ بازوں سے
ہوئے کیوں حملہ آور تم پہ دنیا کے غُراب آخر

ترا ایماں ہو فولادی تو پھر دنیا کے آہن گر
نہ ہوں گے وقتِ حرب و ضرب تجھ پہ فتح یاب آخر

خدا صادق خدا کا دین حق سچے ہیں پیغمبر
نہیں کچھ بھی جو ہو کاشانۂ ملت خراب آخر

بنا کر کاروانِ ملتِ بیضا رہِ حق پر
چلو تم تاکہ ہو منزل اسی میں کام یاب آخر

اڑیں کافر فلک پر اور مومن خاک پہ رنگیں
ملا ہے انتم لا عالون کا تم کو جواب آخر

نہیں سمجھا ہے اے خورشیدؔ تو میسر کلیمی کو
حضوری بن گئی تیری مقامِ صد غیاب آخر

دعائے اجتماعِ ملت

الہٰی اجتماعِ امتِ احمد کا ساماں کر
کبھی اوراقِ ملت کا نہ شیرازہ پریشاں کر

نہ کر یوں مسلمِ شوریدہ سر کو بادیہ پیما
نہ اس کی راہ میں حائل تفرق کے بیاباں کر

خدا کے واسطے لے کام مسلم آہِ سوزاں سے
ہر اک ظلمت کدہ میں سوزِ دل سے پھر چراغاں کر

بنا لے مشتری دنیا کے بازارِ محبت کو
کسی کو اپنا دل دکھلا کے دل لینے کا ساماں کر

بتوں کے حسن کا دیدار کر بزمِ محبت میں
نہ ان کے گیسوئے ہندو کو عارض پر پریشاں کر

مداوا زخمِ دل کا حسنِ یثرب کی ملاحت ہے
نمک بحرِ عرب سے لے کے زخموں کو نمک داں کر

منانی عید ہے گر تجھ کو الفت گاہِ وحدت میں
تو قرباں گاہِ اسمٰعیل پر جاں اپنی قرباں کر

نظر آ جائیں گے الفاظ و معنی سب ترقی کے
کلام اللہ سے پہلے جدا غفلت کا جزداں کر

چراغِ غول کو خاموش کر وحدت کی پھونکوں سے
ستائے اہر من تجھ کو اگر تو وردِ یزداں کر

کسی کے حسن کی پردہ دری ظالم نہ کر دینا
نگاہِ ناز کے جتنے ہوں ناوک دل میں پنہاں کر

مٹا پھر داغ ناکامی کا دامانِ تمنا سے
خدارا کچھ دنوں چشمِ عمل کو اپنی گریاں کر

جو خواہش ہے بقا کی شوق سے آ لیگ کی جانب
نہ ظلماتِ تذبذب میں تلاشِ آبِ حیواں کر

خدا کے واسطے اب چھوڑ دے راہیں تنزل کی
تو ناقہ ارتقا کی وادیوں میں اپنی جولاں کر

خدارا! سیکھ لے حرفت کو، صنعت کو، تجارت کو
تو اپنی ذات کو رسوا نہ اے مردِ مسلماں کر

نہ مر پیرس کی خوبی پر، نہ مٹ لندن کی صورت پر
تصور کر بدخشاں کا خیالِ ملکِ ایراں کر

کوئی خورشیدؔ سے کہہ دے کہ مسجودِ خلائق بن
شرف پیدا تو اپنی ذات میں در خوردِ انساں کر

سرحدِ آزاد

دام کے حلقے ہیں راہیں سرحدِ آزاد پر
بار ہے پروازِ مرغانِ چمن صیاد پر

گو شہیدوں کا دہانِ زخم بے آہنگ ہے
پھر بھی شکوہ ہے زبانِ خنجرِ جلاد پر

جان کر کُنجِ قفس کو رست گاری کی فضا
باندھتا ہے تارِ آہن سے ستم ایجاد پر

آج برقِ طور پر خنداں ہے برقِ تل غراف
دیدۂ اہلِ صفا گریاں ہیں اس بنیاد پر

لالہ کار اب بھی ہے کہساروں میں خونِ گرمِ عشق
یہ فسانہ ختم ہو سکتا نہ تھا فرہاد پر

قطرۂ اشکِ ندامت ہوں وہ برگشتہ نصیب
تہمتِ پرواز ہے جس کی ہر ایک افتاد پر

اب نہیں رنگِ نشاط آشفتگی کا بھی نشاں
رحم فرما اے جمالِ یار، دل ناشاد پر

اے قفس والو! فلک کا شکوۂ بے جا فضول
منحصر تاثیر ہے اندازۂ فریاد پر

دامنِ اقبال کی کوتاہیاں بھولے ہوئے
فخر کرتے ہیں خصوصیاتِ قومِ عاد پر

عصرِ موجودہ کا ہے رنگِ تمدن شعلہ بار
منحصر تہذیب ہے پروازِ استبداد پر

یا فریبِ وہم ہے یا جز ہوا کچھ بھی نہیں
قصرِ استعمار ہے تعمیر جس بنیاد پر

ہوں یزیدِ عصر سے خورشیدؔ ہم مرعوب کیوں
مدتوں سے چل رہے ہیں سنتِ سجاد پر

وحدتِ اسلامی

وہ دور اونچے پہاڑوں پہ ایک لالہ زار
مری نگاہ کو دیتا ہے جنبشِ بیکار

نظر لڑی تو سہی تنک کے گر گئی ہے مگر
یہ وادیوں کی زمیں پر ہے وہ سرِ کوہسار

فرازِ کوہ پہ پریوں کا رقص ہوتا ہے
ہر ایک پھول کے دامن پہ ناچتی ہے بہار

خموشی چھائی ہے حیرت ہے پھول کے منہ پر
چٹک چٹک کے کلی بن گئی ہے نغمہ زار

بنی ہوئی ہے پہاڑی ہر اک عروس جواں
گندھی ہے پھولوں سے چوٹی گلے میں پھولوں کے ہار

طلسمِ رنگ نے حیرت میں ڈال رکھا ہے
لگا دیا ہے نگاہوں کو رنگِ گل نے شرار

ہر ایک جام میں بھر دی گئی شرابِ طہور
نہ سر گرداں ہے کسی کا نہ بیشتر ہے خمار

ہوا وہ حاکمِ اعلیٰ گورنرِ ذی جاہ
کہ جس کے فیضِ عدالت سے ہے وطن کا وقار

اگرچہ چار طرف موج خیز تھا طوفاں
اگرچہ ورطۂ بنگال تھا قیامت زار

وہ مملکت کا نگہباں وہ نا خدا اپنا
سلامتی سے سفینہ کو لے گیا ہے پار

بنے غلامِ محمد تو بن بلالِ حبش
کہ تیرے در کے گدا بھی ہوں صاحبِ سرکار

رموزِ مملکتِ خویش خسرو دانند
نظر میں نیل کا موسیٰ کی ہے چڑھاؤ اتار

نئے نظام کی تشکیل میں ہے پھر آئیں
نئے کلام کی تجدید میں ہے پھر گفتار

بدل رہا ہے جہاں باں جہاں کی راہِ عمل
قدم سنبھل کے اٹھاتا ہے چرخِ گنجِ رفتار

سمجھ کے دین میں وحدت اٹھائے جو تو قدم
ہو تیرے زیرِ نگیں ملکِ چیں دیارِ تاتار

بنائے مرکز وحدت کا نام تھا کعبہ
بنے خدا کا مکاں جس میں جمع ہوں دیندار

یہ بال الجھے ہوئے موئے زلفِ ژولیدہ
عروسِ دینِ نبیؐ بن کے پہلے ان کو سنوار

جو قطرہ قطرہ بہم ہو بنے وہی دریا
جو ریزہ ریزہ ہوا سنگ بن گیا ہے غبار

بنے ہیں اطلس و دیبا و قاقم و سنجاب
بکار گاہِ اخوت بہم ہوئے جو تار

طیور تجھ کو سمجھنے لگیں گے سارے ہما
تو صید گاہِ اخوت کا ہو گیا جو شکار

وفورِ لالہ و گل سے بنا ہے دشتِ چمن
سرورِ بادہ و مل سے ہے مست ہر مے خوار

یہ ہند و سندھ یہ پنجاب سب ہے ملکِ خدا
ہر ایک چیز کا مالک ہے وہ خدائے قہار

ہے کوش مرکزِ وحدت پر ہے چوب کی صدا
تمہارا ایک وطن اک جہاں ایک دیار

دعا خدا سے ہے خورشیدؔ ملکِ پاکستان
جہاں میں رہے آزاد و خود مختار

دہریت

تو نے سمجھا ہے کہ دنیا کا خدا کوئی نہیں
خالقِ ہر دوسرا ارض و سما کوئی نہیں

ہے تمنائِ قلزم خود بخود جوئے کم آب
بحر ہے، کشتی ہے، لیکن ناخدا کوئی نہیں

کہسار و دشت میں بانگِ رحیل کارواں
سازِ گوشِ رہرواں ہے قافلہ کوئی نہیں

چاک دامانِٔ گل ہی اپنے ہاتھوں کی رہیں
باغباں کوئی نہیں بادِ صبا کوئی نہیں

خود بخود ہی چاک ہو جاتا ہے دامانِ سحر
غرفۂ خاور سے یعنی جھانکتا کوئی نہیں

بے دہن آواز ہے نغمہ ہر اک بے ساز ہے
گرمیٔ محفل ہے خود گرمِ نوا کوئی نہیں

ٹھنڈی سانسیں بھرتی جائے غنچگی کو دیکھ کر
باغ میں ایسی نسیم، ایسی ہوا کوئی نہیں

شمع خود جلتی ہے خود بجھتی ہے خود محفل میں ہے
ظلمتیں خود مٹتی جاتی ہیں ضیا کوئی نہیں

جس طرف چاہو چلے ہے جادۂ منزل وہی
راہبر کوئی نہیں ہے رہنما کوئی نہیں

نقشِ آدم خود سنور کر پھر بگڑ جاتا ہے آپ
موت کا اور زندگی کا فلسفہ کوئی نہیں

میں نے سن کر یہ کہا مرتا نہیں کیوں آفتاب
کیوں تمہیں معلوم اس کی انتہا کوئی نہیں

ارتقا ہوتا ہے انساں تک پہنچ کر ختم کیوں
بعد اس کے کوئی عالم کیوں بھلا کوئی نہیں

ہے یہ سب خورشید افلاسِ تخیل کی دلیل
جز مشیت انحطاط و ارتقا کوئی نہیں

یاسیات

شہر اور بستی تو کیا مامن کو صحرا بھی نہیں
غیر نے چھوڑا کہیں اک دشت و دریا بھی نہیں

درسِ قرآں دے رہا ہے آپ سمجھا بھی نہیں
اتحادِ قوم سے واعظ شناسا بھی نہیں

کھا گئے دیوان گانِ عشق کو کہسار کیا
طورِ سینا اب ہے سونا کوئی موسیٰ بھی نہیں

ہیں غلامِ یثربی کفار کے نرغے میں پھر
ان کے سر پر آج کیا آقائے بطحا بھی نہیں

ہند و روم و چیں ترے ہاتھوں سے کیوں چھینا گیا
مردِ مومن آج تک تو نے یہ سمجھا بھی نہیں

کیا بتاؤں میں تجھے تشنہ دہانی کا علاج
قافلہ تیرا کنارِ رودِ گنگا بھی نہیں

تم نے سمجھا غیر کے حصے میں ہے توپ و تفنگ
پیرویٔ ملت و آئینِ آبا بھی نہیں

ہے ترا طوفِ حرم بے فائدہ مردِ خدا
تو نے صنعت گاہِ یورپ کو تو دیکھا بھی نہیں

جزوِ ایماں واقفیتِ صنعت و حرفت کی ہے
تیرا محمل آج وہ ہے جس میں لیلیٰ بھی نہیں

تو نمازیں پڑھ کے سمجھا ہے اگر اتمامِ دیں
یہ مرض وہ ہے کوئی جس کا مداوا بھی نہیں

کشف والو تم سے پوشیدہ رہا ایٹم کا راز
دین ہے ناراض، راضی تم سے دنیا بھی نہیں

لذتِ آزادگی گلشن سے تھا نا آشنا
دام میں الجھا مگر خورشیدؔ تڑپا بھی نہیں

شہیدِ سیاست (یہ نظم ۱۰۔ مارچ ۱۹۵۳ء کو لکھی گئی)

قرطبہ و بغداد و دہلی بھیجتے ہیں پھر سلام
تجھ پہ اے لاہور، اے خونی کفن، اے نیک نام

قصرِ استعمار کی رنگینیاں بھی ہیں عجیب
خواجگی ہے بندگی کے خون سے پھر لالہ فام

ایشیا والوں کو آزادی کا ملنا ہے محال
بن گئے ہیں ایشیا والے غلاموں کے امام

مٹ چکے افسانے چنگیز اور تیمور کے
خواجگی سمجھی نہیں لیکن ابھی تک یہ نظام

جورِ استبداد سے مٹتے ہیں جو رنگیں نقوش
ان کو دوبارہ جلا دیتا ہے چرخِ نیلی فام

موت سے اس واسطے غازی جو ہیں ڈرتے نہیں
جانتے ہیں عرصۂ ہستی نہیں جو ایک گام

ملتیں مٹتی نہیں افراد مٹ جانے کے ساتھ
رخ بدلتا ہے زمانہ موڑ کر اپنی زمام

پھر براہیمی حکومت کر رہی ہے آذری
بت بنا کر بھیجتی ہے جانبِ بیت الحرام

ہے اگر منظور سیر جلوہ ہائے جناں
خوف کا اللہ سے دشمن سے ڈرنا ہے حرام

کر چکا ظاہر خدا جب دین کی تکمیل کو
پھر تحفظ چاہیے ختمِ نبوت کا مدام

بندگی کو عشق خاک و خون میں تڑپائے گا
خواجگی بہرِ تماشا آ گئی بالائے بام

ہو سیہ مستی میں بھی باقی اخوت کی تمیز
بھر کے دے پیرِ مغاں وحدت کا کوئی ایسا جام

وقت سے پہلے ہی پی لی ہائے تو نے کیا کیا
نیم رس ہے تیری بادہ مے ابھی تیری خام

ناخدا ڈوبی ہوئی کشتی کے ہیں کرسی نشیں
اس کا اے خورشیدؔ ہو سکتا ہے ساحل سا مقام

پیغام

بت خانہ آذر کے رنجیدہ ہیں سب اصنام
معتوب نگہٗ مومن مقضوب نظر اسلام

مشرک کے تعاون سے وحدت کی اشاعت ہے
بت خانوں سے دیتے ہیں پھر سوئے حرم پیغام

قشقہ بہ جبیں نکلا معشوقِ صنم خانہ
اے شیخِ حرم ہم بھی دیکھیں گے ترا اسلام

پھر لیگ کے ایواں میں سب جمع ہوئے دین دار
اللہ کا احساں ہے اللہ کا ہے انعام

سر جادہ پاکستاں آتا ہے نظر روشن
سرگرمِ سفر ہو کر مسلم نہ کر اب آرام

ملت کے پرستارو! ہمت کو نہ اب ہارو
آغاز نمایاں ہے، روشن ہے بہت انجام

کیا بے سر و سامانی جب تمھیں ربانی
باطل سے نہیں دبتا جو لیتا ہے حق کا نام

بیدار ہوئے سارے بازی بھی نہیں ہارے
ملت کے پرستار اب قوم کے سب خدام

ملت کا نہیں ساتھی مشرک کا موالائی
برہاں کا ہوا پا یا حجت کا ہوا اتمام

اے رہروِ کعبہ سن ایمان کی باتیں ہیں
بادہ سے نہیں دھلتا میلا ہو اگر احرام

کب فتح ہوئی حاصل اس کو کہ جو ہو باطل
حق ہو نہیں سکتا ہے دنیا میں کبھی ناکام

نہرو سے نہ کھائے گا خورشیدؔ فریب آخر
سینہ میں ہے کچھ ایماں دل میں بھی ہے کچھ اسلام

قربانیوں کی عید

وہ ایک لالہ صحرائے انبیائے جلیلؑ
خلیلؑ کے چمنستان کا پھول اسماعیلؑ

زباں پہ آج ہماری ہے اس کا ذکرِ جمیل
وہ بزمِ عشق میں تھا نغمۂ ربابِ خلیلؑ

وہ آج عشق کی راہوں کے موڑ پر آیا
فضائے حسن کی رنگت بڑھا رہا ہے قلیل

وہ کوہ کن بھی ہے معمار ہے حرم کا بھی
کہ جوئے شیر بھی دریائے خوں کی ہے تمثیل

انہیں کے خون کی سرخی لگائی جاتی ہے
فسانہ عشق کا پاتا ہے جب کہیں تکمیل

وہی حسیں جو صفا پر تھا طور پر پہنچا
بڑھایا چشمہ زم زم کو تابہ رودِ نیل

یہ راہ وہ ہے جہاں ہر قدم پہ ہے منزل
مگر نظر نہیں آتا نشانِ سنگ و میل

چھری جو باپ نے بیٹے کے حلق پر رکھی
قدم بڑھا کے لپک کے ہیں آئے جبرائیلؑ

وہ بن کے پہلا ستارہ افق کے فاراں پر
کچھ ایسا چمکا کہ ہے بے نیازِ رحیل

ازل کی پہلی مشیت میں لکھ رہا ہے کوئی
وہ بن سکے گا ابد تک نہیں فنا کی دلیل

حریمِ ناز کو کعبہ بنانے والے سن!
تو ہی ہے نجد کی لیلیٰ کا حسنِ چشمِ کعیل

الم ترا کے نظارہ سے یاد آیا مجھے
تمہارے بام کے نیچے کا اک واقعۂ فیل

جہاں میں آئی ہے خورشیدؔ عید قرباں آج
ہمارے مائدہ کی لذتیں ہیں بذلِ خلیلؑ

شامِ عید

اللہ رے شام عید نزاکت ہلال کی
باریکیاں بتانے لگا ہے وصال کی

کہتے ہیں ایک ماہ سے جو چیز تھی حرام
تھوڑی سی محتسب نے بھی اب تو حلال کی

اللہ یاد آیا حسینوں کو دیکھ کر
تفسیر پڑھ رہا ہوں یحب الجمال کی

افسانہ یاد ساحلِ کوثر کا آ گیا
وہ جھمگٹا لگا ہے دکاں پر کلال کی

ملبوس ہیں لباس میں پھولوں کے گل بدن
نکھری ہوئی ہے شکل ہر اک نونہال کی

آزادیوں کی عید ہے آزاد ملک میں
باقی رہے دلوں میں نہ صورت ملال کی

رخسار ان کے دیکھ کے ہونٹوں کی جنبشیں
وقتِ نشاط عید ہیں صورت سوال کی

ہنگامِ عید وقتِ مسرت ہلالِ شام
تھی کروٹیں حسین تمھاری ہی چال کی

طوقِ طلائی اس پہ گریباں کھلا ہوا
پسلی بھڑک اٹھی فلک کے کہنہ سال کی

حوروں نے وقتِ شام مہِ نو کی شکل میں
جنت سے لا کے رکھی گلابی زلال کی

خورشیدؔ شامِ عید کی پیاری مسرتیں
مقدور ہو تو جمع کروں ایک سال کی

نادانئ مسلم

اللہ کا بندہ ہے اصنام کا شیدائی
اے عقلِ چہ می گوئی اے عشق چہ فرمائی

کیوں سطوتِ آبائی اب تک نہیں یاد آئی
یہ موت کی غفلت ہے یا تیری شکیبائی

کعبہ سے بھی نسبت ہے ظاہر میں ہے بطحائی
قرآں کو سمجھتا ہے انجیلِ کلیسائی

حیراں ہوں کہ کیوں ڈوبی گنگا کے دہانے میں
دجلہ سے جو چھینی تھی کسرائی و دارائی

غداری ملت بھی اسلام سے الفت بھی
اے ننگے سلف تجھ سے دین کی رسوائی

جب تک نہ عقابی ہو مومن کی نگاہوں میں
پرواز میں رفعت کی بیدار ہے نازائی

کفار کے نرغے میں پھر تیرے غلام آ کے
یثرب سے دکھا دے پھر آقائی و مولائی

ترکی ہوں یا افغانی ہیں سنگِ مسلمانی
اپنوں سے صف آرائی غیروں سے شناسائی

کردار سے خالی ہو جو قول نہیں ایماں
مومن نظر آتے ہیں اس دور کے فرسائی

رفعت تو ہے بھولی تو رنگینی گلشن کو
اک شب کے لیے شبنم ہے گل کی تماشائی

مرتے ہوئے شیروں کے پھندے میں پھنسایا
دزدی ہے نہیں لیکن یہ جرات یغمائی

خورشیدؔ کی غربت بھی خورشید کی شرکت ہے
تاج سرِ ملت ہے وہ گنبد خضرائی

لیگ

جب لیگ کی مجلس میں بجنے لگی شہنائی
سازِ سرِ محفل سے پر ہول صدا آئی

(نوٹ: قلمی نسخے میں "پُر ہول" کی جگہ پہ "جاں سوز" بھی لکھا ہوا ہے)

اس کی نہ تمنا رکھ خلقت ہو تماشائی
رنگیں کفنی باید چوں لالۂ صحرائی

وا ماندۂ منزل سے ہمت کا تقاضا ہے
اُف وسعتِ صحرائی اُف! چرخ کی پہنائی

اٹھ رہروِ خوابیدہ ہوتے ہیں کمر بستہ
اب قافلہ والے سب پھر بانگِ درا آئی

اے تاجِ شہیِ فرق مسلم ترا خواہاں ہے
تو بھی درِ وحدت پر سکھلا دے جبیں سائی

مبہودِ سخن دانی قرآن سے ہو جانا
ہے وقت کی نادانی اے دشمنِ دانائی

ایثار و اخوت کی شمشیر پہ صیقل کر
بے تیغ نہیں ہوتی گیرائی و دارائی

فرعون کو بے ساماں ہر چند کہیں لیکن
مرہونِ عصا نکلی ہر رنگ سے موسائی

اقوال کی محفل میں کر رقصِ عمل پیدا
محفل پہ کہاں رنگت بے رقص و سرود آئی

اک راز ہیں قومیت اک رمز وطن بھی ہے
تو ان سے نہ ہو واقف اسلام کے شیدائی

سن راہرو پاکستاں تو غور سے سن لے یہ
کانٹوں میں الجھ کر بھی رکتے نہیں سودائی

لذت ہے خلش میں بھی کانٹوں پہ تو رکھ پاؤں
وحشت کا زمانہ ہے گلشن میں بہار آئی

ہشیار کے ایماں کو آتا ہے پرکھنے پھر
دل دارِ صنم خانہ معشوقِ کلیسائی

فارابی و رازی گو اب تم میں نہیں باقی
تم ایک سمجھ لینا سینائی و جینائی

پنجاب میں اک خضرِ گمراہ ہوا پیدا
ہے جعفر و صادق کا گویا یہ بڑا بھائی

خورشیدؔ نہیں بنتی بے سعئ عمل قسمت
خود پردہ نشیں کیوں ہو مرہونِ تماشائی

بیان کی حقیقت

دیکھ قرآں کی زباں ہے قائداعظم کہ تو
قولِ حق کا ترجماں ہے قائداعظم کہ تو

مولوی کی پرورش ہے کفر کے آغوش میں
دوست دادِ دشمناں ہے قائداعظم کہ تو

ریش برداری تری مقصد برارِ دیں نہیں
مصطفیٰ کا رازداں ہے قائداعظم کہ تو

اے محدث کفر کی تنظیم اور تو پیش پیش
دینِ حق کا پاسباں ہے قائداعظم کہ تو

خندہ زن ہے کفر اور تو دین کی میت پہ آج
کون اس پر نوحہ خواں ہے قائداعظم کہ تو

گو نہیں ہے پاس اس کے جبہ و دستار و جریب
فوجِ ملت کا نشاں ہے قائداعظم کہ تو

چیلہ گاندھی کا رسول اللہ کا نائب بنے
اب رفیق گمراہاں ہے قائداعظم کہ تو

ننگ اسلاف آج بے شک مسلمانوں میں ہے تو
دین و ملت کا زیاں ہے قائد اعظم کہ تو

ارتقائے دین و ملت کے لیے خورشیدؔ آج
مضطرب آتش بجاں ہیں قائد اعظم کہ تو

ساقی نامہ

ہم محمدؐ کا جو لے لیتے ہیں نام اے ساقی
پاک کر لیتے ہیں یوں بادہ و جام اے ساقی

عید کب ہو گی، تو کب انجمن آرا ہو گا؟
ختم ہو جائے گا کب ماہِ صیام اے ساقی

بھول جاتے ہیں جہاں کرتے خرابات کی راہ
کیا کوئی ہوتا ہے ایسا بھی مقام اے ساقی

لالہ زار آب رواں بھی تو آ جا آ جا
چودھویں رات کا بن ماہِ تمام اے ساقی

منع کرتے نہیں ہم پینے پلانے کو مگر
اپنے گرتے ہوئے مستوں کو بھی تھام اے ساقی

لوگ کر لیتے ہیں مے خانہ میں جس شے کو حلال
وہ تری بزم میں کیوں ہوگی حرام اے ساقی

کیف طاعت میں بہکنے نہ لگیں بادہ خوار
آج مے خانہ میں بن تو ہی امام اے ساقی

تاج شاہی بسرو خلعتِ زریں در بر
آج کس رنگ میں ہے تیرا غلام اے ساقی

اب کہاں ہے وہ ترا کوئے خرابات بتا
جلوہ فرما تھا جہاں تو سرِ بام اے ساقی

جوشِ الفت کبھی اٹھتا ہے تو سن آتے ہیں
تیرے خورشیدؔ سے ہم تیرا پیام اے ساقی

مشقِ ستم

کرم جب شاہدِ قدرت کا دیوانوں پہ ہوتا ہے
فلک کا ہر ستم گویا مسلمانوں پہ ہوتا ہے

نظر آتی ہیں زیرِ کہکشاں رعنایاں شب کی
تری زلفوں کا خم مائل اگر شانوں پہ ہوتا ہے

نگاہوں میں جھلک جاتی ہے سرخی خونِ مسلم کی
کوئی عنواں بھیانک سا جب افسانوں پہ ہوتا ہے

مرے دستِ جنوں کا وارداتِ سینہ کاری میں
کرم کچھ دامنوں پر کچھ گرہبانوں پہ ہوتا ہے

لو خود بیزار پردہ طلعتِ جانانہ ہے اب تو
انھیں کا نام اب الفت کے افسانوں پہ ہوتا ہے

جلی وہ شمع بزمِ مشرقِ پنجاب میں مسلم
کرم جس کا ہمیشہ اپنے پروانوں پہ ہوتا ہے

ترے وحشی ہوا کرتے ہیں جس دم مائلِ جولاں
قدم اک آسماں پہ اک بیابانوں پہ ہوتا ہے

تڑپ جاتے ہیں بلبل قمریاں بے تاب ہوتی ہیں
خزاں کا وار جب کوئی گلستانوں پہ ہوتا ہے

نہیں ہوتی ادائیں حسن میں جلوہ فروشی کی
مدار ان کا بہت کچھ دل کے ارمانوں پہ ہوتا ہے

دعائیں کرتے ہیں مظلوم و بے کس رات دن یا رب
نزولِ قہر کب تک خستہ سامانوں پہ ہوتا ہے

کلیجہ منہ کو آتا ہے جو دل تڑپے ہے پہلو میں
گزر خورشیدؔ جب برباد ایوانوں پہ ہوتا ہے

طبِ قدیم

یہ طب قدیم تو ہے مگر طب کہن نہیں
کیا اہلِ علم واقفِ طرزِ سخن نہیں

(نوٹ: "طب قدیم تو ہے یہ طب کہن نہیں" مصرع اولیٰ قلمی نسخے میں یوں رقم ہے مگر یہ مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف "مفعول فاعلات مفاعیل فاعِلن" کے وزن پر نہیں۔ ہم نے کاتب کی متوقع سہو کو رفع کر دیا ہے۔)

یہ پھول وہ ہے اب بھی نہیں جو خزاں شناس
نا آشنا بہار سے اس کا چمن نہیں

نا واقفانِ علم و ہنر کو ہے اس سے بیر
رکھتے ہیں اس سے بغض مگر اہلِ فن نہیں

طبِ جدید میں بھی یہ مانا ہے عطریت
لیکن گھٹے گی عطر سے مشکِ ختن نہیں

مصنوعی حسن دیکھ کے طبِ جدید کا
اہلِ نظر پکارے یہ وہ بانک پن نہیں

باغِ قدیمِ طب میں نظارگی سے پوچھ
نرگس نہیں کہ سرو نہیں یاسمن نہیں

وہ طب ہماری طب ہے کہ محوِ مکالمہ
جس کے زباں نہیں کوئی جس کے دہن نہیں

حبِ قدامت اس کی ضیا بڑھنے والی ہے
یہ آفتاب وہ ہے کہ جس کو گہن نہیں

آلات و کیمیا میں ہے طبِ قدیم امام
خورشیدؔ اس کو بھولتے اہلِ زمن نہیں

ایڈیٹوریل نظم

خدا کے واسطے اک بار اور نام کرو

ہوئی ہے شام ڈھلا دن زمانہ اور ہوا
چراغِ روز ہوا گل تو شب کا دور ہوا
فلک غریب پہ کس درجہ ظلم و جور ہوا
سیاہ کاریٔ شب کا عجیب طور ہوا
فلک کا دیکھیے دامن ہزار دھبے ہیں
نجوم کیا ہیں مگر بے شمار دھبے ہیں

نسیمِ صبح کی بندش ہوئی زمانے میں
ہزار طرح رکاوٹ ہے آنے جانے میں
چھپی ہے بلبلِ بستان بھی آشیانے میں
ہے محوِ شمع سرِ بزم دل جلانے میں
گرے ہیں دیدۂ گردوں سے اشک شبنم کے
الٰہی آج یہ سامان ہوئے ہیں کس غم کے

فلک کا سینہ کواکب سے داغ دار ہوا
قمر کے نور کو ظلمت سے انتشار ہوا
زمانہ آج تو بے طرح سوگوار ہوا
سیاہ پوش فلک ماتمی شعار ہوا
سر شکِ نسری ہے چرخ کے نشیمن پر
گرے ہیں عقدِ ثریا کے قطرے دہن پر

عجیب حال کھلا ہے شہابِ ثاقب کا
فلک کی آہ کا شعلہ زمین کی سمت چلا
تمام اہلِ زمانہ کی ہستیوں کو خدا
یہ شعلہ آہ کا اس دل جلے کی دے نہ جلا
دعا یہ ہے کہ ہر اک کو نشاط حاصل ہو
نہ بے قرار کسی کا بھی یا خدا دل ہو

یہ بات کیا ہے سمجھتے بھی ہیں بھلا احباب
جگر ہے سوزِ محبت سے کس کی جل کے کباب
سنا ہے طبِ کہن کا ہوا ہے خانہ خراب
نہیں ہے حامئِ کار اس کا کوئی شیخ و شباب
کوئی فضول کوئی بے ہودہ بتاتا ہے
کوئی دوائیں جو دیکھے ہے منہ بناتا ہے

اسی کا نام تو ہے انقلاب اے حضرت
فضول آج ارسطو کی ہو گئی حکمت
زمانہ چاہے جسے اک گھڑی میں دے عزت
کرے ذلیل جسے چاہے شومئ قسمت
نہ یاد گار رہا اب امامِ فن کا کوئی
نہیں ہے بیٹھنے والا اس انجمن کا کوئی

نہیں ہے رونقِ یونان اندر و ماخوس
ہوا ہے ختم زمانہ میں دورِ جالینوس
نہیں ہے ان کی طبابت سے اب کوئی مانوس
ہیں آج ان کے طرف دار بے طرح مایوس
کبھی تو اوجِ ترقی پہ کامیاب یہ تھے
کبھی تو چرخِ طبابت کے آفتاب یہ تھے

زباں پہ اب تو ہر اک کی یہی ہے افسانہ
خراب ہو گیا طبِ کہن کا کاشانہ
نہ شمع ہی کا نشان ہے نہ کوئی پروانہ
سبوئے بادۂ احمر ہے اور نہ پیمانہ
اگی ہوئی ہے در و بام پر ہر اک جا گھاس
کھڑی ہے در ہی پہ ویرانی اور حسرت و یاس

اجڑ گیا ہے طبابت کا اب چمن بالکل
کسی جگہ سے نہیں آتی نکہتِ سنبل
نہ اس میں طوطی و قمری رہی نہ ہے نہ بلبل
نہ سرو کا ہے پتا اور نہ ہے نشانِ گل
اب اس میں خاک ہی نکہت کے بدلے اڑتی ہے
نسیم دیکھ کے یہ دور ہی سے مڑتی ہے

نشان ایسے بھی ملتے ہیں جن سے فرزانہ
سمجھ سکے کہ یہاں بھی تھا کوئی میخانہ
کہیں کہیں ہیں پڑے پارہ ہائے پیمانہ
پڑی ہے شمع پہ کچھ اب بھی خاکِ پروانہ
سبو میں یاس کے آنسو شراب کے بدلے
جلا ہوا دلِ حسرت کباب کے بدلے

مگر میں تم کو بتاؤں کبھی یہ تھا عالم
کہ اس کو سمجھے ہوئے تھا ہر اک رشکِ ارم
ہوئے تھے عیش کے سامان اس میں خوب بہم
اسی کا اہلِ زمانہ میں تھا ہر اک ہمدم
اسی میں ختمِ فلاطون دھرا ہوا دیکھا
اسی میں ساغرِ جم کو لب آشنا دیکھا

لطیفؔ اس میں شرابِ لطیف لاتا تھا
امین اس کی امانت کا ذمہ دار بنا
اسی کے در پہ تھا جابر سا پاسبان کھڑا
سبب یہ تھا جو نہ غیروں کا اس میں فصل ہوا
مگر اب ان میں سے کوئی نہیں رہا باقی
شراب ختم ہوئی اور چلا گیا ساقی

انہیں کا کوسِ تفاخر تھا ہر جگہ بجتا
فلک پہ پہنچے تھی اک پل میں ان کی فکر رسا
سمجھ لیا تھا انہوں نے نظام عالم کا
انہوں نے نقشۂ ارض و سما بنایا تھا
نہیں جو فلسفیانِ قدیم سے مانوس
انہوں نے دیکھا ہی کب ہے نظامِ بطلیموس

ہے آج اہلِ زمانہ کا اوعاد باطل
کہ ہم بھی فنِ طبابت میں ہو گئے کامل
ابھی ہے نقص و کمی ان میں بے حساب اے دل
سفر و راز بہت ہے بڑی کڑی منزل
ابھی دواؤں میں ان کی شفا کا راز کہاں
مزاج دیکھ سکیں اتنا امتیاز کہاں

جدید طب میں دوا ہے کہاں وہ مشفقِ من
بنائے جسمِ جذامی کو پل میں جو کندن
ہمارے دشت نوردوں میں بھی ہے اتنا فن
جڑی کے دیتے ہی اچھا ہوا مریض کہن
رگڑ کے دیں جو کسی کو کبھی کوئی بوٹی
رسن حیات کی جڑ جائے گرچہ ہو ٹوٹی

مگر یہ سچ ہے عروسِ کہن ہوا یہ فن
اور اس کے سامنے ہے اک نئی نویلی دلہن
اگر نہ اپ سجائیں گے اس کو مشفقِ من
پسند کون کرے گا ڈھلا ہوا جوبن
مناسب اب تو یہی ہے کہ مل کے کام کرو
تمہیں قسم ہے کہ ایک بار اور نام کرو

خدا کے واسطے ہمت نہ ہار دیجیے گا
زمانہ روئے گا گر مٹ گیا نشان اس کا
یہی تو نقش پئے کارواں کا دے گا پتا
یہی تو منزلِ مقصود کو بتائے گا
سفر کرو گے اگر تم اسی سمندر میں
تو نام پاؤ گے دنیا کے بحر و بر میں

یہی یتیم وہ ہے جس کی سرپرستی کا
خدا نے آپ کی قسمت میں حصہ رکھا تھا
نہیں یہ بات کسی طرح خوب اہلِ وفا
کہ مشکلوں کے سبب تم نہ ساتھ دو اس کا
یتیم بھی ہے ضعیف و نحیف بھی یہ ہے
جو دل میں سوچو نجیب و شریف بھی یہ ہے

یہی نشان ہے اجڑے ہوئے شبستاں کا
یہی ہے پھول خزاں یافتہ گلستاں کا
ٹپکنے ہی کو ہے یہ اشک چشمِ گریاں کا
ہے ایک تار ہی باقی یہ جیب و داماں کا
حفاظت اس کی نہ کی پھر تو بات کیا ہوگی
رہا نہ یار جو پہلو میں رات کیا ہوگی

سمجھ لو مجھ کو غنیمت کہ ڈھلتا سایا ہوں
میں پتلا درد کا گویا بنا بنایا ہوں
بیانِ حضرتِ خورشیدؔ سن کے آیا ہوں
رسالہ طب کا عجب اپنے ساتھ لایا ہوں
پڑھو خرید کے اور مل کے دل سے کام کرو
خدا کے واسطے اک بار اور نام کرو

(نوٹ: رفیق الاطبا کی ایڈیٹوریل نظم کے طور پر یکم مارچ ۱۹۱۶ء کو یہ نظم شائع کی گئی تھی۔)

دنیا

دنیا جسے کہتے ہیں اک موجۂ گل بو ہے
یا برق کی چشمک ہے یا اک رم آہو ہے

ژولیدگیٔ پختہ کم بخت میں ہے اتنی
محروم کشائش ہے اک عقدۂ لولو ہے

طوطی پسِ آئینہ ہر چیز ہے دنیا کی
افسانہ ہے افسوں ہے نیرنگ ہے جادو ہے

تاریک فضاؤں میں ہستی کے مظاہر ہیں
دنیا شبِ گلشن ہے ہر شے گل شبو ہے

ہےِ حسنِ حوادث میں دنیا کی جگہ لیکن
ژولیدگیٔ گیسو یا اک خمِ ابرو ہے

آغوشِ تمنا ہے خمیازہ کشِ حسرت
ننگِ نگہِ الفت پہ زال نکو رو ہے

امواجِ حوادث کی ہے جنبش طوفانی
بیدائے شہادت میں سیلابِ فنا جو ہے

آوازِ شکستِ رنگ اس گلشنِ ہستی کی
پیرایۂ قمری میں ہر نغمہ کو کو ہے

ہر نقشِ وجود اتنا ہے رنگِ فنا آلود
اثبات کی صورت میں انکار کا پہلو ہے

ہر ساز شکستہ ہے ہر نغمہ ہے افسردہ
اے مطربِ ہستی تو اس پر بھی طرب خو ہے

آوارگیٔ راہِ عشرت یہ مٹا کیوں کر
اک نقشِ گدازِ غم خورشیدؔ اگر تو ہے

جھولنا

لطف اندوز جنبش ہے کیا جھولنا
دل مرا یا کہ ہے آپ کا جھولنا
جھولنے والے صلِ علیٰ جھولنا

آ گئی کام یوں زندگی کی ہوس
جڑ گئے ٹوٹنے والے یوں تارِ نفس
دل تمہیں جب جھلانے لگا جھولنا

ہو گئے سرد آذر کے آتش کدے
بجھ گئے ہیں جہاں بھر کے آتش کدے
دل تمہیں جب جھلانے لگا جھولنا

تھا صنم خانوں میں ایک محشر بپا
قصرِ کسریٰ ہلا کنگرا گر گیا
کچھ ہوا ایسی دینے لگا جھولنا

وہ حبیب خدا اشرفِ انبیاؐ
ختم جن پر نبوت کا قصہ ہوا
بن گئے ان کے ارض و سما جھولنا

پھر طیورِ جناں چہچہانے لگے
جھولنا ان کا سب مل کے گانے لگے
جھولتے ہیں حبیبِؐ خدا جھولنا

جب قریب آ کے ایک دم پلٹنے لگا
بادۂ عشق کا کیف گھٹنے لگا
دل سے کیا کھینچ کر لے چلا جھولنا

جنبشِ بنفسِ عالم کی تصویر ہے
زندگی جہاں کی یہ تدبیر ہے
دونوں عالم کا دل بن گیا جھولنا

نکہتیں کوئے گلشن سے آنے لگیں
پھر بہاریں تماشا دکھانے لگیں
پھر ہلانے لگی ہے صبا جھولنا

کالی کملی کا دے آج صدقہ مجھے
نیگ دیجے مرے آج مولا مجھے
گا چکا میں ترا نغمہ زا جھولنا

اک پلہ پہ خورشیدؔ قائم رہا
دوسرا چاند کے دل کا تھا مدعا
روز و شب نے بنایا ترا جھولنا

مخمس

وحشتیں ہوتی ہیں مضموں مرے افسانوں کے
سارے نقشے ہیں تخیل میں پرستانوں کے
آج بنتے ہیں قلم خار بیابانوں کے
شوق مکتوب میں بھی لطف ہے دیوانوں کے
خط لکھے جاتے ہیں ٹکڑوں پہ گریبانوں کے

ماتمی آئے ہو پوشاک بدل کر صاحب
دل ہوا جاتا ہے بے چین مچل کر صاحب
مردے جی اٹھتے ہیں قبروں سے نکل کر صاحب
پاؤں رکھنا مری تربت پہ سنبھل کر صاحب
ہیں نہاں خاک میں شعلے ابھی ارمانوں کے

بحرِ الفت میں سفینہ نہ کوئی ساحل ہے
عشق کہتے ہیں جسے ہائے بہت مشکل ہے
پرسشِ دل یہ بتاتا ہوں تمہیں کیا دل ہے
عشق کی راہ میں دل ہی تو وہی اک منزل ہے
قافلے لٹتے ہیں جس جا مرے ارمانوں کے

سببِ سوزِ جگر پوچھ نہ مجھ سے ساقی
بادہ خواری کا اثر پوچھ نہ مجھ سے ساقی
آج تو میری خبر پوچھ نہ مجھ سے ساقی
کیفِ صہبائے نظر پوچھ نہ مجھ سے ساقی
صدقے آنکھوں کے چھلکتے ہوئے پیمانوں کے

آسماں مجھ سا زمانے میں نہ لایا کوئی رند
جز مرے دل میں نہ ساقی کے سمایا کوئی رند
لائقِ بادہ کشی جبکہ نہ پایا کوئی رند
بعد پینے کے سہی یاد تو آیا کوئی رند
فاتحہ دیتے ہیں جو ٹکڑوں پہ گریبانوں کے

ہے غمِ عشق کہ سو غم ہیں الٰہی توبہ
لب پہ صد نالۂ پیہم ہیں الٰہی توبہ
ہم سے درماندہ بہت کم ہیں الٰہی توبہ
عافیت کوش وہی ہم ہیں الٰہی توبہ
منظر پھٹے ہیں ساحل پہ طوفانوں کے

ہو گیا سوزِ غمِ دل کا مداوا خورشیدؔ
کہتے ہیں پھر ہے سرِ طور تماشا خورشیدؔ
اٹھ گئی خود ہی نقابِ رخِ زیبا خورشیدؔ
ہے حرم میں کوئی آمادۂ جلوا خورشیدؔ
بجھتے جاتے ہیں چراغ آج صنم خانوں کے

اظہارِ فنا

بوسوں نے لب کی دی ترے جس دم صدائے کیف
رنگِ رخِ صبیح بنا ماجرائے کیف
تھی زلفِ عنبریں سے معطر فضائے کیف
ہم تم جہانِ کیف میں تھے مدعائے کیف
تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

ہو کر نگاہِ عشق نے جس وقت قبلہ رو
کی حسن کے پسینہ سے رخ پر ترے وضو
جاری ہوئیں زبان پہ آیاتِ آرزو
بڑھے میری صلوٰت پہ حسناتِ رنگ و بو
تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

رنگینیاں شفق کی تھی جب جنتِ نظر
تم میرے ساتھ تھے سرِ کوہسار جلوہ گر
اف تیرا حسن، اف تیری رعنائی کا اثر
شرمندگی سے پھول جھکانے لگے تھے سر
تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

ساحل پہ تیرے ساعدِ سمیں سے گل بدوش
جب میں تھا اور تم مری تسکینِ صبر و ہوش
وادی تیرے لباس گویا تھی سبز پوش
دریا ہوا تھا حیرتِ جلوہ سے جب خموش
تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

قرباں ہماری آہ پہ تاثیر جب ہوئی
پیدا وصالِ یار کی تدبیر جب ہوئی
اک برق مرتعش سی بغل گیر جب ہوئی
مربوط حسن و عشق کی تصویر جب ہوئی
تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

تھا جب مقابل اژدر و شیر و پلنگ سے
دریا میں خوف تھا نہ مجھے جب نہنگ سے
جب موڑتا تھا پشت نہ میدانِ جنگ سے
جب مشغلہ تھا ہاتھ کو تیغ و تفنگ سے
تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

نقشِ دوئی مٹا کے میں جب خانقاہ میں
تھا محوِ ذکر اشہد ان لّا اللہ میں
خلوت گہِ جمال تھی ہر دم نگاہ میں
میں واجب الوجود کی تھا جب پناہ میں
تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

اپنی خودی مٹا کے میں جب محوِ ذات تھا
جس دم بیانِ موت میں درس حیات تھا
اک ایک ذرہ جب کہ مجھے کائنات تھا
جب مدعا حیات کا صوم و صلوٰت تھا
تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

جس وقت میں تھا حسن در آغوش طور پر
جب جل رہے تھے حسنِ جہاں تاب سے حجر
جب ہو گیا تھا ایک اشارے سے شق قمر
جب تھا مرا خطاب شہنشاہِ بحر و بر
تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

رنگِ قضا مٹا کے میں نقشِ حیات سے
جب بحث کر رہا تھا طبعیٔ نکات سے
پردے اٹھا کے فلسفۂ کائنات سے
حکمت ٹپک رہی تھی مری بات بات سے
تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

خورشیدؔ ابن رشد سے جب روشناس تھا

بو نصر و بو علی کا سمجھتا تھا مدعا

تھا یعنی یک قدم مجھے میدانِ ارتقا

رنگِ زوال صحتِ ابداں مٹا دیا

تھی موت اس گھڑی بھی مرے انتظار میں

تلاشِ یار

قوسِ قزح کا پردۂ رنگیں اٹھا کے دیکھ
گوشے نجومِ چرخ کی شمعوں کے جا کے دیکھ
سر بستہ غنچگی سے نگاہیں ملا کے دیکھ
دامن جھٹک کے موجۂ بادِ صبا کے دیکھ
جلوے کہاں ہیں شاہدِ شریں ادا کے دیکھ

بن کر حجابِ راز گھٹا جب کہ چھا گئی
ہم شکلِ رعد چرخ پہ آہِ رسا گئی
بجلی تڑپ تڑپ وہ ادائیں دکھا گئی
آغوشِ عشق میں تری تصویر آ گئی
تو بھی نقابِ عارضِ زیبا اٹھا کے دیکھ

اک سمت زلزلوں کی گرج میں تری صدا
ترا قصور وارنہ سمجھا نہ سن سکا
پھر رعد کی کڑک میں بہت کچھ تو کہہ گیا
لیکن نہیں ہے غم جو میں سب کچھ بھلا چکا
اب بے کسوں کی آہ میں بھی کچھ سنا کے دیکھ

پہنچ چکا نگاہ کو میں شش جہات میں
دن میں تلاش کیا تجھے ڈھونڈا ہے رات میں
خاکے تیرے کھینچے ہیں بہت بات بات میں
ناکامیٔ نظر ہے ابھی حسنِ ذات میں
کہہ دے مجھے خلوصِ محبت میں پا کے دیکھ

کعبہ میں تیرے گھر میں تجھے ڈھونڈ کر پھرا
محراب و سقف و در میں تجھے ڈھونڈ کر پھرا
ہر شام میں سحر میں تجھے ڈھونڈ کر پھرا
خورشید میں قمر میں تجھے ڈھونڈ کر پھرا
دل نے کہا کہ مجھ کو بھی گردن جھکا کے دیکھ

اے نورِ کائنات ترے حسن کی قسم
عرفات میں اگر نہ ملے تو نہیں ہے غم
ظلمت کی منزلوں سے بڑھا دے مرا قدم
دل اور خلوصِ جذبۂ الفت کو کر بہم
پھر اپنی جلوہ گاہ میں مجھ کو بلا کے دیکھ

دادِ تلاش فکرِ جنوں زا ملی تو ہے
پر کیف جس سے دل ہو وہ صہبا ملی تو ہے
جس کو سمجھ رہا تھا میں عنقا ملی تو ہے
قلبِ سلیم میں تری دنیا ملی تو ہے
اب چھپ کے دیکھ جلووں کو اپنے چھپا کے دیکھ

بتلا کہاں کہاں میں تری جستجو کروں
دیر و حرم میں جاؤں تو کیا آرزو کروں
زم زم پہ تیری یاد میں پہنچوں وضو کروں
گنگا کے ساحلوں پہ کبھی شست و شو کروں
کس سمت لے چلے مجھے جھونکے ہوا کے دیکھ

پھر جلوہ ہائے طور کا ساماں ہوا تو ہے
بالائے بام کو نمایاں ہوا تو ہے
خورشیدؔ شامِ ہجر کا پایاں ہوا تو ہے
زلفیں ہٹیں ہیں وا رخِ جاناں ہوا تو ہے
لو شمعِ نورِ قلب کی تو بھی بڑھا کے دیکھ

تصوراتِ جمال

بہت پھرا ہوں حرم میں حرم کی راہوں میں
سکوں تلاش رہا زہد کی پناہوں میں
سراغ مل نہ سکا کچھ بھی سجدہ گاہوں میں
مڑی ہیں ڈھونڈ کے نظریں جو خانقاہوں میں
تلاش کرتی ہیں رحمت تری گناہوں میں

سرود و ساز کا آہنگ بھی ہے نغمۂ راز
رباب و چنگ میں آخر کوئی تو ہے دم ساز
دہانِ نے سے نکلنے لگی تری آواز
حقیقت آئی نظر جب اٹھی نقاب مجاز
کہ ہے تو ہی تو حسینوں کی خواب گاہوں میں

جمال و حسن کی کیسی حسین دنیا ہے
جہاں کا منظرِ دل کش عجب نرالا ہے
جہاں نگاہ کی راحت جمالِ رعنا ہے
جہاں کی سیر کا حور و پری کو سودا ہے
تڑپ رہے ہیں شہید ان حسین راہوں میں

سرورِ بادہ جدا تاک کا گداز الگ
جدا ہے نغمہ و نے اور نے نواز الگ
ہیں حسن و عشق گو اپنے اپنے راز الگ
بنا رہے تو ہیں نقشِ نیاز و ناز الگ
مری نگاہ میں تو میں تری نگاہوں میں

دلِ شکستہ لیے کوئی تیرا متوالا
جگر پہ داغ کسی کے کسی کے تبخالا
کسی کے لب پہ فغاں شیون و بکا نالہ
چمن کی خاک سے خونی کفن گل و لالہ
اٹھیں گے حشر کے دن تیرے داد خواہوں میں

قیامت ایک نئی حشر میں اٹھاتے ہیں
بہشت حسنِ ارم سے جدا بناتے ہیں
جو فتنے سوئے ہوئے تھے انھیں جگاتے ہیں
تماشا حسن و محبت کا پھر دکھاتے ہیں
بلائے جاتے ہیں شاہد مرے گواہوں میں

جمالِ یار نگاہوں تک آج آ ہی گیا
جگر کے زخم پہ مرہم کوئی لگا ہی گیا
ہمارے نالہ کو بابِ قبول پا ہی گیا
نقیبِ عشق کسی بزم تک بلا ہی گیا
اثر ہوا تو ہے خورشیدؔ میری آہوں میں

چاند کی سیر

چشمِ قمر ہوئی ہے وا وقتِ نمودِ شام ہے
مہرِ جہاں فروز کا کُنجِ فنا مقام ہے
کس کو یہاں ثبات ہے کس کو یہاں قیام ہے
توسن بے عناں ہے دہرا شترِ بے زمام ہے
کرسئ نور پر نہیں ساقئ آفتاب بھی
گل ہوئی شمع میکدہ ختم ہوئی شراب بھی

چشمِ قمر کو شوقِ دید تابشِ روزگار کا
رختِ سفر بدوش ہے عزم ہے خاک زار کا
خضر و مسیحی کی تلاش قصد ہے رہ گزار کا
مدِ نظر علاج ہے سینۂ داغ دار کا
ملکِ بقا کو چھوڑ کر عالمِ بے ثبات کو
پانے چلا ہے شام سے ڈھونڈ رہا ہے رات کو

گردِ سفر سے زرد رو قلب و نظر میں ارتعاش
رختِ وجود تار تار سینہ و قلب پاش پاش
کاوشِ خارِ غم کا راز پائے فگار سے ہے فاش
کوئے مغاں کی آرزو جام سرور کی تلاش
چہرہ کا رنگ بن گیا حیرتِ رنگِ آرزو
آنکھ اگرچہ ایک رخ پلکِ نگاہ چار سو

تاروں کا میرِ کارواں بن کے چلا ہے ماہتاب
تلخِ بدشت آج ہے ترکِ فلک بھی ہم رکاب
کہکشاں بتا گئی راہ کے طول کا حساب
کوسِ رحیل دیکھ کر زہرا نے رکھ دیا رباب
چشمِ قمر کو جستجو محفلِ خاک داں کی ہے
آنکھ زمین کی طرف سارے ہی کارواں کی ہے

سجدۂ شوق کا نشاں نورِ جبینِ ماہ کا
شرق سے غرب کی طرف عزم حرم کی راہ کا
ظرف بنا ہوا تمام دیدِ طلب نگاہ کا
راستہ پوچھ کر بڑھا طور کی جلوہ گاہ کا
یاد کبھی خلیل کی دھیاں کبھی کلیم کا
پوچھتا ہے نشاں کبھی جادۂ مستقیم کا

ذوق کے چل کے خود سنوں داد و رسن کی داستاں
شوق کے آپ دیکھ لوں تیشہ کی تیز کاریاں
زہرہ و شانِ خاک کا مجھ پہ بھی حسن ہو عیاں
عشق کا جوئے شیر میں ہوتا ہے کیسے خوں رواں
زہرہ سے ماہ نے کہا نجد کی وادیوں میں چل
منطقۂ بروج کی قیدِ فرنگ سے نکل

شام کو جب ہوں دشت کے قلب میں قافلے رواں
جبکہ ہو ریگ میں نمی نرم ہو مثلِ پرنیاں
ایک طرف بڑھے چلیں راح لہائے کارواں
عزم مسافروں کا ہو راسخ و پختہ و جواں
شوق میں چاند بھی چلے اُنہیں کا ہو کے ہم رکاب
چاند ہو ان سے فیض یاب چاند سے ہوں وہ فیض یاب

زہرہ کو یہ خیال ہے وہ بشر گریز پا
جو نہ فضائے خلد میں دل کی نشاط پا سکا
دشت میں ڈھونڈتا ہے کیا کوہ میں دیکھتا ہے کیا
گل کا طلسم و رنگ و بو کیوں ہے اسے لبھا رہا
چھوڑ کے سلسبیل کو پہنچا ہے کیوں فرات پر
غازۂ مرگ کیوں ملا اس نے رخِ حیات پر

ابرِ بہار اٹھا چڑھا چرخ کی سمت چھا گیا
حسن فضا کی اور بھی نیلو فری بڑھا گیا
پیکِ صبا مگر پیام ایسا کوئی سنا گیا
رفعتِ چرخ چھوڑ کر ابر زمیں پہ آ گیا
برق تڑپ اٹھی سحاب رونے لگا ہے زار زار
روئے زمیں ہوا ہے تر بھیگ گیا ہے کوہسار

شبنمِ سیمبر کو ہے محفلِ گل کی آرزو
خلوتِ نیم شب میں ہے اس کو کسی کی جستجو
کہتے ہیں جس کو خاک داں یہ طلسم و رنگ و بو
سحر کا ایک مقام ہے جذب و کشش ہے اس کی خو
اپنی فتادگی میں خاک رکھتی ہے عرش پر نظر
اس کے قدم پہ سجدہ ریز ہوئی ہے شبنمِ سحر

خاک کی پتلویوں کا حسن ایک طلسمِ راز ہے
ناز ہے ان کا جاں ستاں ہوش ربا نیاز ہے
نغمہ ہے روح کی غذا جس کا یہی وہ ساز ہے
غرفۂ خلد سے حسیں دیدۂ نیم باز ہے
خاک کے ذرہ ذرہ کو گھیر لیا جمال نے
اپنی بہشت ڈھونڈ لی آدمِ خوش خیال نے

سینۂ خاک چیر کر اگتے ہیں لالہ زار بھی
عارضِ گل کا رنگ ہے خونِ رگِ بہار بھی
بنتی ہے جنتِ نظر سبزئ شاخ سار بھی
پھولوں سے ہے بھرا ہوا دامن کوہسار بھی
حسنِ سوادِ سبزہ زاد غیرت چرخِ اخضری
خاک کے ذروں میں کوئی زہرا ہے کوئی مشتری

دیکھیے چشمِ شوق سے باغ کی حور ہے کلی
دل کا سرور ہے کلی آنکھ کا نور ہے کلی
دخترِ نور ہے کلی بنتِ سحور ہے کلی
بلبل اگر کلیم ہے باغ کا طور ہے کلی
حسنِ بتانِ آذری جو ہے عیاں کنشت میں
جلوہ کہاں وہ حور میں حسن کہاں بہشت میں

قطب نے چاند سے کہا میں ہوں مدارِ کائنات
میں ہوں نشاں سمت کا میں ہوں بنائے شش جہات
کر نہ سکے گا ہم سفر ترا مجھے میرا ثبات
دیکھ رہا ہوں دور سے خاک کے میں عجائبات
ساحلِ رودِ گنگ پر چاند ترا جو ہو گزر
ترک و مغل کو دیکھنا کیا نہیں ہے ابھی وہ تاجور

طرز ہے کیا معاش کی فکر ہے کیا معاد کی
بن تو نہیں گیا ہے وہ قوم سمود و عاد کی
نسل بدل تو لی نہیں دینِ عرب نژاد کی
قوم رہی سہی ہے اب بھی کہیں مفاد کی
اپنے لہو سے صبح و شام کر کے شفق طرازیاں
دشت و جبل میں اب بھی ہیں کیا وہی تیغ بازیاں

وہ جو تجھے کہیں ملے دینا اسے مرا پیام
یعنی ہے ملتوں کا کیا دہر کی اب بھی وہ امام
کیسے ہیں اس کے روز و شب کیسی ہے اس کی صبح و شام
دشت و جبل میں نسب کیا اب بھی اس کے ہیں قیام
تختِ کئی اسی کا ہے وارثِ جامِ جم ہے وہ
یا کہ بتوں کے حسن کا لطفِ کشِ ستم ہے وہ

دور ابھی مقام ہے ختم نہیں ہوا سفر

راہ تری دراز ہے سخت ترا ہے رہ گزر

ناقہ بھی بڑھائیے چل کے حد سے تیز تر

کرتے ہیں یاد دیر سے تجھ کو وطن کے بام و در

کہنا کہ خورشیدؔ کا ایک پیام اور ہے

تیرے لیے بجھا ہوا ہند میں دام اور ہے

ایک حسینہ پر نظر

بالوں کا عالم رخ پر نرالا
کچھ کچھ اندھیرا کچھ کچھ اجالا
بھرتا ہے آہیں ہر آنکھ والا
سنبھلا کہاں دل کتنا سنبھالا
ہے جھٹ پٹا سا وقتِ سحر کا
نیرنگِ بنیش دھوکہ نظر کا

ہر آنکھ ان کی جادو بھری ہے
پلکوں کے پر ہیں اور یہ پری ہے
چتون میں ساری فتنہ گری ہے
ہاں دلبری ہی ہاں دلبری ہے
زلفِ پریشاں میں خود سری سی
اڑتی ہوئی ہے کالی پری سی

دیکھے سے جس کے ہوش و خرد گم
ہونٹوں پہ رقصاں موجِ تبسم
دریائے خوبی وقفِ تلاطم
پھولوں کی بارش وقتِ تکلم
عاشق کے آگے پتلی حیا کی
وقتِ جفا بھی صورت وفا کی

ہنگامِ شوخی برقِ طپاں ہے
گاہے نہاں ہے گاہے عیاں ہے
باتیں ہیں میٹھی شیریں زباں ہے
گرویدہ جس کا سارا جہاں ہے
رنگین ادائیں نیچی نگاہیں
کھولیں گی دل پر فتنوں کی راہیں

بلور میں ہیں رنگِ شہابی
رخسار ان کا یا ہے گلابی
صورت کا نقشہ کل آفتابی
تصویر رنگیں چہرہ کتابی
آنکھوں کے اندر شوخی بلا کی
شاکی خدائی جس کی جفا کی

پھولوں میں رخ کے رنگت جفا کی
پھر اس پہ آفت نکہت حیا کی
جنبش لچک میں بادِ صبا کی
دامن چمن کا کلیاں قبا کی
سر سے کمر تک تصویر رنگیں
پاؤں سے سر تک تصویر رنگیں

آنکھوں کے فتنے محشر بدامن
دست و گریباں فتنوں سے چتون
نیچی نگاہیں جادو ہیں پرفتن
عاشق کے دل پر ہیں سحر افگن
رخسار گورے آنکھوں میں لالی
منظر طلسمی صورت نرالی

نیرنگِ فطرت قدرت خدا کی
مٹی پہ ظاہر صفت خدا کی
انساں سے پیدا نسبت خدا کی

ہاں وہ حسینہ ہاں وہ حسینہ
ہے جس کا سینہ اک آبگینہ

کانِ صفا کا ناسفتہ گوہر
چرخِ جفا کا تابندہ اختر
خورشیدؔ طلعت مہ وش ستم گر
ہر دم شکستِ پیماں کے خوگر
آنکھوں سے ظاہر کیفت جوانی
رنگ ارغوانی پوشاک دھانی

پینے کو آگے مینا دھری ہو
ساحل پہ ہم ہوں اور وہ پری ہو
ہاتھوں کو شغلِ پردہ دری ہو
بوسوں سے عارض نیلو فری ہو

(نوٹ: یہ نظم ماہنامہ "عالم گیر لاہور" کے ماہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہو چکی ہے)

ناکامی وکامیابی

جب پت جھڑ دل مغموم کرے ہر طوطی کا ہر بلبل کا
جب شاخ سے رشتہ کچھ نہ رہے پژمردہ ہو کر ہر گُل کا
جب الجھے اپنے بالوں سے دل باغ میں شاخِ سنبل کا
جب طاق کے سارے خوشہ میں اک قطرہ بھی نہ رہے مُل کا
اس وقت کی یہ خاموش فضا پیغام سنائے جاتی ہے
ہے بادِ صبا اب چلنے والی فصلِ گل اب آتی ہے

جب سوکھی شاخیں شائیں شائیں تند ہوا سے کرتی ہیں
جب سننے والا سنتا ہے یہ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں
جب چڑیاں ان سوکھی شاخوں پر ننھے پنجے دھرتی ہیں
جب بھوکی لوٹ کے جاتی ہیں جب آ کر بھوکی مرتی ہیں
اس وقت کی یہ پُر شور فضا پیغام سنائے جاتی ہے
اب بادِ صبا ہے چلنے والی فصلیں گل بھی آتی ہے

جب بزم بچھڑتی دیکھ چکا گلزار میں مالی پھولوں کی
جب رفتہ رفتہ اڑنے لگی رخسار سے لالی پھولوں کی
جب ٹوٹ گئی مرجھا مرجھا کر نازک ڈالی پھولوں کی
گلشن میں ہوئی جس وقت مکمل خستہ حالی پھولوں کی
پھر ابر اٹھا قبلہ کی طرف سے جھوم پڑا گلزاروں پر
سر سبز ہوا وہ سبزہ بھی جو لوٹتا تھا انگاروں پر

جب چشموں کو پیغام سنائے صر صر نے گرم آبوں کے
جب الٹے نتیجے ملنے لگے امید بھرے سب خوابوں کے
رخصت پہ ہوئے جب مائل جوڑے سارس کے سرخابوں کے
جب چشمے سارے سوکھ گئے دریاؤں کے تالابوں کے
پھر ابر اٹھا قبلہ کی طرف سے جھوم پڑا گلزاروں پر
سر سبز ہوا وہ سبزہ بھی جو لوٹے تھا انگاروں پر

جب رات کو صحنِ گردوں پر یوں حالت بدلی تاروں کی
ہو جیسے چٹیل میدانوں میں کیفیت انگاروں کی
جب ساری زمینیں سوکھ گئیں صحراؤں کی گلزاروں کی
جب اڑنے لگی کچھ دھول سی لالہ زاروں کی کہساروں کی
پھر ابر اٹھا کاشی کی طرف سے برسا برج کے ساحل پر
پھر موجیں آئیں دریاؤں میں ٹھنڈک پہنچی ہر دل پر

ہوتا ہے وہی وقت اٹھنے کا جب قوم کوئی گر جاتی ہے
یعنی خشکی بڑھ جانے کے بعد میں برسات آتی ہے
وہ شاخ ہری ہوتی ہے پہلے پہلے جو مرجھاتی ہے
جب مشعل پہلے جلتی ہے تب راہ کہیں دکھلاتی ہے
خورشیدؔ اسی اک دانہ سے جو خاک میں پہلے ملتا ہے
صحرائے عمل کی وادی میں گلزارِ تمنا کھلتا ہے

(یہ نظم ماہنامہ "عالمگیر لاہور" کے خاص نمبر 1 میں ۱۹۳۲ء کو شائع ہو چکی ہے)

قصیدہ یادِ رفتگاں شکوۂ دورِ زماں

مرغِ کبودِ فلک بیضۂ زر زیر پر
می نہداز شامِ روز تا کہ میز آید سحر

صبح نے بیدار کیا پہلوئے شبِ چیر کر
نور کے گھوارہ میں لعلِ کا لختِ جگر

سمتِ افق پہ آفتاب اس طرح آیا نظر
نیل کے ساحل پہ موج ڈال گئی ہے گُہر

چرخ کا طاس کبود خرقۂ صد طپلساں
نذر کی خاطر لیے آیا ہے پیش نظر

دایۂ لیلائے شب زینتِ آغوشِ آب
کرتی ہے طفلِ محل رکھتی ہے رومی پسر

دخترِ بت خانہ شب خواہرِ کیواں لقب
طفلکِ مسلم کو آج دیتی ہے شیر سحر

تیغ لیے برق تاب نکلا ہے پھر آفتاب
لشکرِ رومی نژاد ہونے لگا پے سپر

طائفی رومان کے دانے تھے بکھرے ہوئے
طایرکِ کوہِ طور چننے لگا سر بسر

کاخِ سحر کے لیے محوِ عمل آفتاب
صرفۂ تعمیر ہے انجم کی ہر خشتِ زر

ماہ نے دف رکھ دیا زہرہ نے رکھا رباب
ختم ہوئی بزمِ شب ساقی ہوا پے سپر

طاس میں مہرِ منیر چرخ کے ہے غسل گیر
پھول کا دامن ہوا اوس کے پانی سے تر

زمزمہ پیرا ہوئی طوطئ نہ و بالِ چرخ
بادۂ شبنم میں پھر گھول رہی ہے شکر

شب کی سیہ کاریاں ہونے لگیں پھر عیاں
صبح نے دکھلا دیا لالہ کا دامانِ تر

نیل کے پانی میں پھول جیسے کنول کا کھلے
چرخ پہ یوں آفتاب صبح کو آیا نظر

جنبشِ پرواز میں حسنِ بہار آ گیا
مرغکِ غنچہ نے کھول لیے بال و پر

لالۂ صحرائی کی دیکھ ذرا آب و تاب
انجمنِ گل میں ہے شمع خنک جلوہ گر

دشت و بیاباں میں نور، قدرتِ حسن کا ظہور
محوِ اطاعت طیور جانبِ کوہ و کمر

خضر کی صورت وضو سبزہ سرِ آب جو
کرتا ہے اب سو بسو رکھتا ہے سجدہ میں سر

محوِ اطاعت ہوا دے کے موذنِ اذاں
قافلے چلنے لگے باندھ کے رختِ سفر

راحلے سجنے لگے آتی ہے بانگِ رحیل
بڑھنے لگے راہوار پیشِ حمار و شتر

کہتے ہیں چکر میں ہے خود فلکِ پیر بھی
مہدِ زمیں کو بھی ہے جنبشِ زیر و زبر

پیکرِ نوری نہیں پہلوئے شب میں نجوم
قطرے لہو کے ہیں یہ خون ہوا ہے جگر

تاروں کا محبس بنا کاخ کہن چرخ کا
تخت پہ ہے آفتاب اک شہِ تنہا نگر

جادے چمکنے لگے راہیں جھلکنے لگیں
از سرِ نو آنکھ میں پیدا ہوئی ہے نظر

صبح کی وادی میں ہیں چند ستارے ابھی
بکھرے ہوں زیرِ تخیل جیسے رطبہائے تر

قطرۂ شبنم پہ ہیں بر سرِ ہر برگ و بار
اززنِ ملکِ حبش بچۂ رومی ہزار

صبحِ افق میں تھا ایک نور کا بحرِ رواں
آیا مجھے دور سے ساحلِ سسلی نظر

ارضِ مراکش پہ تھی میری نظر تیز تیز
عظمتِ رفتہ کا پھر ڈھونڈ رہی تھی اثر

دہلی سے بغداد تک عرصۂ یک گام تھا
دولتِ غرناطہ کے ایک طرف تھے کھنڈر

خطہ جنت نظیر ہائے وادئ الکبیر
مانگتی تھی نظر کو آنکھ سے میری گہر

گنگ و چمن سے بڑھا جانبِ آبِ فرات
دجلہ و دینوب نیل میری نظر کا سفر

پردۂ تصویر کے مٹتے ہوئے سے نشاں
ایک طرف ستیان ایک طرف باختر

اجڑا ہوا ملکِ رے یاس فزا تخت کے
راستہ بھولے ہوئے غوری و آلِ تمر

سمتِ قحستان عرب اپنے فرائض سے دور
دخترِ دہقاں کا گیت بے اثر و بے ضرر

خشک ہے دریائے نیل سوکھے ہوئے ہیں نخیل
آج خزاں دیدہ ہے کشتِ امل کے شجر

رزم کے میدان میں غیر مبا زر طلب
نیزہ شکستہ عرب کند ہے تیغِ تبر

ہند کے مظلوم بھی کہتے ہیں اللہ سے
پوچھنے جائیں کہاں ترک و مغل کی خبر

آلِ یہودا کو ہے دعوئِ خیر الامم
دہر میں ہے منفعل امتِ خیر البشر

بوم کا آشیاں گنبدِ افرا سیاب
دھر میں ہے کاخ کے آج نحوست کا گھر

ہے رہِ منزل میں گم قافلۂ قرطبہ
غیرتِ عباس نے جنگ میں ڈالی سپر

دجلہ کے گیسو کا خم غیر کے شانوں پہ ہے
نیل کی زلفِ دراز آج ہے ژولیدہ تر

تانہ پرد طوطیٔ حسنِ زمرد اساس
بازینۂ حلقۂ گیسوئے عودی لباس

دیدۂ نرگس نہ ہو کیسے تحیر اثر
صبح کے دامن پہ ہے خونِ شفق تازہ تر

آنکھ میں تیری نمی اشک ترے شبنمی
روتا ہے کس پھول کو آج تو نجمِ سحر

سبزۂ خوابیدہ آج میتِ مسموم ہے
اوس کے پانی میں زہر کس نے دیا گھول کر

ماہیتِ شے ہے کیا ہے جہان سیمیا
صحنِ چمن کے ہیں پھول دامنِ شب کے شرر

فیض کا چشمہ نہیں ساحلِ آبِ حیات
اس کے کمالات ہیں بخل کے آئینہ گر

طایرک شاخسار کچھ نہیں فیضِ بہار
رنگ و نوا پر ہوئی قیدِ نفس منحصر

باغِ جہاں کی روش گاہ خزاں گہہِ بہار
خاک کے دامن میں ہیں پختہ ہوے جو ثمر

آئیں گے پروانے بھی سوزِ محبت کے ساتھ
شمعِ شبستاں تو بن جل تو سہی رات بھر

عشقِ خنک لالہ را شمع صفت سوختہ
خواہشِ قلب و نظر ہیچ نیا موختہ

دورِ زماں کا مزاج کتنا ہے بے ہودہ تر
چھیڑ ہے اس کے لیے عرضِ متاعِ ہُنر

راہِ ہدیٰ میں کوئی نقشِ قدم بھی نہیں
قافلہ اسلام کا آہ سدھارا کدھر

جن کا تھا ہر کارواں صورتِ گنجِ رواں
دشت میں کھویا انھیں کس نے بتا اے خضر

ٹپکا رگِ ساز سے نغمے کے بدلے لہو
آج ہے مضراب میں کیفیتِ بیشتر

قوم جو ناموس تھی دین کی ایمان کی
تو نے وہ کی پائمال اے فلکِ فتنہ گر

پھول تھا نرگس کا جو باغِ جہاں کے لیے
جور کشِ باغباں اب ہے وہی دیدہ ور

جس نے لیا جم سے جام جس کا تھا کسریٰ غلام
جو تھا امم کا امام ہے وہ کہاں تاج ور

فلسفہ یونان کا دبدبہ ایران کا
نور تھا ایمان کا مسلم خستہ جگر

صورتِ سیلاب کوہ اٹھا جو باصد شکوہ
کھا گئے یا رب اسے کوہ و کمر بحر و بر

فکر تری آذری تیرا عمل بت گری

دشمنِ وحدت ہے تو اے فلکِ کینہ ور

خیز کہ وقتِ سحر بر سرِ کوہِ اضم

ساغرِ خورمی ہند ساقیؑ بزمِ قدم

قائداعظم

کھلے زمانہ پہ جب حادثات کے گیسو
دھندلکے پھیل گئے ظلمت بڑھی ہر سو
کہیں سے بن کے مہ نو افق پہ آیا تو

فلک پہ دور شفق کے قریب آیا ہے
ہلال عید کی مانند مژدہ لایا ہے
خدا نے قائد اعظم تجھے بنایا ہے

ترے طفیل بنا آج ملکِ پاکستان
ملال کی تھی جو صورت ہوئی نظر ہنان
ترے طفیل ملی ہم کو منزلِ ایمان

دعا کی نذر

بن گیا خوب ملک پاکستان
امن سے ہیں تمام شہر و دیار

ہم مناتے ہیں جشنِ استقلال
دیکھنے آئیں شاہدانِ تتار

جس نے برطانیہ کو دی ہے شکست
جس نے پایا ہے کانگرس پہ وقار

ہے یہی وہ جناح ذی حشمت
جس کے دم سے ہے مملکت کو قرار

مثلِ غالب زباں پہ لا خورشیدؔ
ہاتھ اٹھا خدا کو اپنے پکار

"تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

داتا گنج بخش

او گنج بخش داتا مجھ کو نہ بھول جانا
ممکن نہیں ہے در سے تیرے ملول جانا
جس نے نہ زندگی کا اپنی اصول جانا
اس بے خرد نے در کو تیرے فضول جانا
او گنج بخش داتا مجھ کو نہ بھول جانا

گھر بار کو لٹا کر نگری میں تیری آ کر
اب پونچھتا ہوں آنسو کچھ کچھ سکون پا کر
رکھ دستِ شفقت اپنا سر پر مرے اٹھا کر
غنچہ شگفتہ دل کا پھر صورتِ صبا کر
او گنج بخش داتا مجھ کو نہ بھول جانا

یہ میکدہ سلامت پھر جمع ہیں شرابی
لا جام افتابی لا مشک بو گلابی
ساقی سمن بروں کو لازم ہے بے حجابی
پیرِ مغاں شتابی پیرِ مغاں شتابی
او گنج بخش داتا مجھ کو نہ بھول جانا

او بے کسوں کے والی او مرثیہ میں عالی
میری طرف نہیں کیوں تو نے نگاہ ڈالی
دکھلا مجھے بھی اب تو کوئی ادا نرالی
جاتا ہے کون در سے تیرے بتا دے خالی
او گنج بخش داتا مجھ کو نہ بھول جانا

اب تک نہیں سنی ہے کیوں داستاں ہماری
در پر ترے کھڑے ہیں ناکام سے بھکاری
او سننے والے سن لے فریاد و آہ و زاری
کچھ دیکھ تو سہی اب اس دل کی بے قراری
او گنج بخش داتا مجھ کو نہ بھول جانا

یہ غم فزا ہوائیں یہ دکھ بھری فضائیں
گردوں ہمیں ستائیں تارے ہمیں جلائیں
شکوے زباں پہ اپنی کیوں کر بھلا نہ آئیں
در چھوڑ کر تمہارا اب ہم کدھر کو جائیں
او گنج بخش داتا مجھ کو نہ بھول جانا

پہنچا ہوں تیرے در تک کس راہ سے گزر کر
بہرِ خدا نظر کر نہرِ خدا نظر کر
ڈوبے ہیں کچھ سفینے منجدھار میں ابھر کر
نقشے بگڑ گئے ہیں بن بن سنور سنور کر
او گنج بخش داتا مجھ کو نہ بھول جانا

تو نے بھی سن لیا ہے خورشیدؔ کا فسانہ
بگڑی ہوئی ہے قسمت دشمن ہوا زمانہ
ان قافلوں کو تو ہی کوئی بتا ٹھکانہ
یہ راحلہ وطن سے جو ہو گئے روانہ
او گنج بخش داتا مجھ کو نہ بھول جانا

او ہند سے آنے والے بتا کس حال میں ہے یارانِ وطن
ان پھولوں پر کیا گزری ہے جو چھوڑ چکے ہیں اپنا چمن
اب وادیٔ گنگا کیسی ہے کس حال میں ہے اب مندرا من
کیا خون ابلتے چشموں سے صحراؤں کی ہے راہ کٹھن
کیا پانی پھیرا جاتا ہے امیدوں پر ارمانوں پر
کیا بیتی ہے دیوانوں پر کیا گزری ہے مہمانوں پر

کیا پھول لدی شاخوں پہ چمن میں اب بھی نشیمن جلتے ہیں
کیا پیٹ کے اگنی پر پنچھی بھی اپنے کلیجے تلتے ہیں
کیا صبح کی ٹھنڈی سانسوں میں منہ اپنے اپنے ملتے ہیں
کیا بادِ صبا غنچوں کی آغوش میں شعلے جلتے ہیں
کیا دل کا لہو آنکھوں میں آ کر اب بھی آنسو بنتا ہے
کیا آنکھ کے پردوں میں آتا ہے آ کر پھر کیا چھنتا ہے

پیامِ خورشیدؔ

اے مسلم خوابیدہ اف تری گردن خوابی
کیا تجھ میں نہیں باقی کچھ فطرت سیمابی
روتی ہے تجھے غافل تاروں کی تنک تابی
کچھ اشک ہیں عنابی کچھ اشک ہیں سیمابی
سوئی ہوئی دنیا کو خورشیدؔ جگاتا ہے
جاگی ہوئی قوموں میں تو نیند کا ماتا ہے

تو لطفِ سحر بھولا گنگا کے کنارے کا
یہ وقت سہانا ہے پر کیف نظارے کا
پیغام نہیں سنتا کیوں صبح کے تارے کا
بے چین سی کرنوں کے رنگین اشارے کا
محمود کے دل سے تھا تو جس پہ کبھی شیدا
وہ حسنِ صنم خانہ ہے وقتِ سحر پیدا

اٹھ بامِ حرم سے پھر آواز اذاں آئی
آمادۂ شورش ہے ناقوس کلیسائی
ہر اک کرن سر پر آ آ ترے تھرائی
قدرت سے تو بے پروا قدرت تری شیدائی
کچھ قافلے آئے ہیں پھر جادۂ ہستی پر
کرتا ہے جرس نالے سوئی ہوئی بستی پر

غازہ رخ گردوں کا خونِ دلِ انجم ہے
کہتے ہیں شفق جس کو یہ خون کا قلزم ہے
طوفانِ فنا شاید مائل بہ طلاطم ہے
سیلاب میں تابش کے کشتیٔ قمر گم ہے
یا آخری آنسو اب چشمِ شبِ عالم کا
مژگانِ افق پر ہے مہمان کوئی دم کا

ڈوبے ہوئے انجم ہیں ٹوٹے ہوئے تاروں میں
بجھتی ہوئی شمعوں میں افسردہ شراروں میں
بے ہوش غریقوں میں طوفان کے ماروں میں
تیری ہی کہانی ہے اب سب کے اشاروں میں
افسانۂ غفلت ہے کیا ہوش ربا تیرا
یہ بسترِ راحت ہے یا فرشِ فضا تیرا

ابرِ بہار آجا

اے ابرِ بہار آ جا
جاں تجھ پہ نثار آ جا
امیدِ برتر آ جا
ہو دل کو قرار آ جا
بہتے ہوئے پانی میں
دریا کی روانی میں

پہلو میں حسینہ ہو
دریا میں سفینہ ہو
ساون کا مہینہ ہو
جینے کا قرینہ ہو
دریا کی روانی میں
آ ڈوب کے پانی میں

طاؤس تڑپتا ہے
بے تاب پپیہا ہے
کوئل کو بھی سودا ہے
جھلسا ہوا صحرا ہے
اے ابرِ بہار آ جا
ہو دل کو قرار آ جا

بجلی کے چمکنے میں
پھولوں کے مہکنے میں
بلبل کے چہکنے میں
نغموں کے ٹپکنے میں
بلبل کے نشیمن میں
آ باغ میں گلشن میں

مے کش کے ابھارے پر
رندوں کے سہارے پر
آنکھوں کے اشارے پر
راوی کے کنارے پر
آئے ہیں حسیں آ جا
اے ابرِ نشیں آ جا

ہر گل کی اڑی لالی
پھر سوکھ گئی ڈالی
گلشن میں ہے بد حالی
پھولوں نے ہوا کھا لی
آ بادِ صبا بن کر
جنت کی ہوا بن کر

کیا شورشِ رندانہ

کیا لغزشِ مستانہ

بادہ ہے نہ پیمانہ

ساقی ہے نہ میخانہ

اے توبہ شکن آ جا

اے سحر فگن آ جا

آ زہرہ جبینوں میں

آ پردہ نشینوں میں

دنیا کے حسینوں میں

گرمی کے مہینوں میں

پھر جوش ابھار آ جا

اے ابرِ بہار آ جا

دنیائے محبت ہے

با صورتِ حسرت ہے

ہر سمت قیامت ہے

سوزِ غمِ فرقت ہے

خورشیدؔ میاں آ جا

آ بہرِ خدا آ جا

سہرا

الفت کی جو راہیں آتی ہیں بنتا ہے وہاں رہبر سہرا
آنکھوں سے جو منزل او جھل تھی اس سمت چلا لے کر سہرا

نوشاہ کریم الدین بنا دل شاد نصیر الدین ہوا
آئی ہے سہانی راتیں آئیں بلبل گانے مل کر سہرا

غنچے چٹکے پھول کھلے جو دل تھے جدا آپس میں ملے
عشرت کی بہاریں آئی ہیں پھولوں کا بنا زیور سہرا

تارے سارے ناچ رہے ہیں چاندنی راتیں کھیل رہی ہیں
چاند کی کھڑکی سے پھر کوئی جھانک رہا ہے گا کر سہرا

آباد یہ صاحب خانہ ہو دلشاد قمر سلطانہ ہو
الفت کا بنے زیور سہرا عشرت کا بنے پیکر سہرا

ہر ایک سہیلی نور بھری حوران میں کوئی ہے کوئی پری
خلوت میں دلہن کو چھیڑ رہی ہیں باہم مل کر گا کر سہرا

اب خوف کسی کی کد کا اور ڈر کوئی نگاہِ بد کا نہیں
دولہا کے رخِ انور پہ بنا ہے نور کی ایک چادر سہرا

خوش ہو کے غیاث و الدین دعائیں دیتا ہے اور کہتا ہے
قسمت کا ہو اسکندر سہرا طالع کا ہو نیک اختر سہرا

خورشیدؔ بھی لکھ کر لایا ہے احباب کے خوش کرنے کے لیے
اچھا سہرا اعلیٰ سہرا افضل سہرا بہتر سہرا

مسرور محمد افضل ہیں شادی کا سماں ہر سو چھایا
مطرب نے عجب انداز سے گایا سازِ عشرت پر سہرا

سہرا

فطرت کی دھن نکلا یہ نور بھرا سہرا
مالن سے کہو دل کی کشتی میں سجا سہرا

کرنوں میں لچکتا ہے اک حسن ضیا جیسے
جنبش میں سرکتا ہے یوں رخ سے ترا سہرا

بلبل کے ترنم میں غنچوں کے تبسم میں
گا بربطِ عشرت پر اے بادِ صبا سہرا

آئینۂ عارض پر ہے عکسِ شفق پیدا
یا شام میں جوانی کی اک شمع بنا سہرا

موجوں نے جوانی کی کس شان سے لی کروٹ
دولہا نے جو کی جنبش کچھ ہلنے لگا سہرا

کچھ پھول شفق گوں ہیں اک شامِ مسرت میں
کچھ ربط سا رکھتا ہے زلفوں سے ترا سہرا

سہرا

ہے شان کوئی سطوتِ فغور ہے سہرا
نوشاہی کا آئین ہے دستور ہے سہرا

انوارِ تمنا سے جو معمور ہیں سہرا
وادیٔ محبت کے لیے طور ہے سہرا

اعمال محبت کی جزا ڈھونڈنے والو
نظارہ کی جنت کے لیے حور ہے سہرا

یا پھول سے رخسار کی رنگین فضا ہے
یا کہیں کہ تابِ رخ پر نور ہے سہرا

(نوٹ: اس سہرے کے باقی اشعار نہیں مل سکے)

تصویرِ غم

یا کریمي ذوالعطا یا انت عافي الخطا
انت رَبِی انت حسبِ یا رفیقِ فيِ الباہ
رب ھب لی من لدنک و رحمۃ فی الابتلا
ربنا افتح لَنَا اَبواب نصرٍ فيِ الوغا
ان یَقُولُ المشرکین للعبادک یا جلیل
اَیُنَ مَولَاکُمُ تَقُولُوا اَیُنَ جَبَّارُ الوکیل

آگ سے تو نے بچایا تھا خلیل اللہ کو
باب رحمت کر دیا یوسف پہ تو نے چاہ کو
تو اگر چاہے تو دے طاقت وہ میری آہ کو
کوہ کو وہ کاہ کر دے کوہ کر دے کاہ کو
نوح پر رحمت ہوا طوفان تیرے فضل سے
مشکلیں آساں ہوئیں ہر آن تیرے فضل سے

شکوہ سے فرصت ملے تو حمد لکھوں شوق سے
کیا جھکوں سجدے میں گردن جھک رہی ہے طوق سے
غیر ہیں نغمہ سرا محفل میں تیری ذوق سے
مجھ پہ ادبار آ رہے ہیں دیکھ تحت و فوق سے
نام تو مجھ کو بھی تیرے اے خدا سب یاد ہیں
پر وہ حسرت کے لیے صرف مبارک باد ہیں

چپ ہیں اہلِ بزم شمع انجمن خاموش ہے
نالہ بلبل کہاں سارا چمن خاموش ہے
وائے ناکامی کہ ہر اہلِ سخن خاموش ہے
بات کیا کیجے کہ ترکِ سیمتن خاموش ہے
حق شناسان را چہ حال افتادو یاران را چہ شد
کس بمیدان رونمی آرد سوارانِ را چہ شد

دیکھ پھر حسنِ تخیل وحشت اندازی نہ کر
گوشہ گیرانِ زمانہ کی تو غمازی نہ کر
درد بڑھنے دے ابھی پہلو میں دم سازی نہ کر
حسن کی رنگت نکھرنے دے نظر بازی نہ کر
نام مت گمنام کا لے پھر بھری محفل میں تو
چرخ فتنہ گر کو کیوں بھولا ہوا ہے دل میں تو

چاہتا ہے کس لیے فردِ تردد دل مرا
برق کی کیا نذر ٹھہرے گر نہ ہو حاصل مرا
صورتِ دریا شکستہ ہی رہے ساحل مرا
دیکھ چارہ گر نہ کرنا درد تو زائل مرا
میری ہستی سے خلش کچھ آسماں کو بھی رہے
کوئی شیدا تو وفا کے امتحاں کو بھی رہے

صورتِ نقشِ قدم میں کارواں کی یاد ہوں
مٹنے والوں کی طرح حسرت کشِ فریاد ہوں
گرچہ ہوں کوئے تمنا میں مگر ناشاد ہوں
یعنی درماندہ بھی ہوں مہجور ہوں برباد ہوں
چھوڑنے والے چلے جاتے ہیں مجھ کو چھوڑ کر
پر نہیں منزل سے بیٹھا میں کبھی منھ موڑ کر

حسرت آرائی مری بزمِ تمنا میں رہے
یعنی سامانِ تلاطم موجِ دریا میں رہے
درد گھبرائے نہ قلبِ نا شکیبا میں رہے
حلقۂ زنجیر پائے دشتِ پیما میں رہے
اختتامِ بزم تک اے شمع سوز و ساز ہو
جان جائے پر نہ اس محفل کا افشا راز ہو

ناوک ان کے تیر کا دل دوز ہووے یا نہ ہو
جذب کی تاثیر میں لیکن کمی اصلا نہ ہو
زخم جو اک بار لگ جائے کبھی اچھا نہ ہو
دیکھ لفظِ مدعا شرمندۂ معنٰی نہ ہو
ہو ادا شورِ قیامت کی مری زنجیر میں
آہ سینہ سے نہ نکلے لذتِ تاثیر میں

لذتِ آزار بڑھ جائے جفا ہو اس طرح
ٹوٹ جائے کاسۂ سائل عطا ہو اس طرح
پیس ڈالے دل کو پھر ہر اک ادا ہو اس طرح
لطفِ محشر آئے ہنگامہ بپا ہو اس طرح
جستجو ہی میں رہوں میں لذتِ دیدار کی
روز بگڑیں بن کے شکلیں لاکھ وصلِ یار کی

خوش نما چاکِ جگر گلشن میں ہر اک گل کا ہے
باغباں شیدا پریشان حالیٔ سنبل کا ہے
ہر چمن میں نام نغمہ نالۂ بلبل کا ہے
تاک کا خونِ جگر سرمایہ جامِ مل کا ہے
یاد جب عاشق کیا کرتے ہیں دورِ جام کو
چپکے چپکے دیکھتے ہیں گردشِ ایام کو

پاسباں کی آنکھ ہے ہلکا مری زنجیر کا
خوب نکلا اب تو شاید سلسلہ تدبیر کا
جانتا ہوں مٹ نہیں سکتا لکھا تقدیر کا
چاہیے پاسِ وفا کچھ تو کسی دلگیر کا
تیرا شیدا تیری محفل میں تو ہو گر خوار ہو
نامناسب ہے جو یہ رسوا سرِ بازار ہو

شکوۂ بے جا نہیں بے تابیٔ دل کو تو دیکھ
رنگ کس کا جم رہا ہے اپنی محفل کو تو دیکھ
کون کرتا ہی عطا سے منع سائل کو تو دیکھ
دیکھنے والے مجھے دیکھا، مرے دل کو تو دیکھ
حسنِ ہمت آزما کو لطف کی تعلیم دے
بے نوا کو تخت دے جاگیر دے دیہیم دے

مدعا کچھ اور ہے روئے سخن کچھ اور ہے
گوشِ گل کچھ اور غنچہ کا دہن کچھ اور ہے
نکہتِ بادِ صبا رنگِ چمن کچھ اور ہے
ذائقہ میں آج صہبائے کہن کچھ اور ہے
آتشِ گل سے نہیں ہے آج شاخِ گل کی خیر
بے خودی کہتی ہے ساقی سے کہ جامِ مل کی خیر

یا رسول اللہؐ تری امت کی حالت زار ہے
یا نبی اللہؐ زمانہ در پئے آزار ہے
بادۂ غفلت سے ہر ایک امتی شر سار ہے
رند کا شکوہ نہیں زاہد بھی عصیاں کار ہے
یا حبیبِ کبریاؐ شافع روزِ جزا
خواہشِ الطاف ہے یا راحت آموزِ جزا

جانبِ مغرب افق میں آفتاب اسلام کا
ڈوبنے والا ہے یعنی وقت آیا شام کا
یا محمد مصطفیٰ صدقہ تمہارے نام کا
جلد کیجے فیصلہ اب گردشِ ایام کا
قرطبہ اور اندلس بغداد اور اسپین کا
فیصلہ جو کچھ بھی ہو لیکن نہ ہو توہین کا

درسگاہِ اندلس نالاں ہے تیری یاد میں
دیکھنا اسلام کی حالت ذرا بغداد میں
قرطبہ کے کچھ کھنڈر مصروف ہیں فریاد میں
مسجدیں اسپین کی سب آ چکی افتاد میں
دیلم و ملکِ مراکش کا ذرا انجام دیکھ
ابتدا میں انتہائے مذہبِ اسلام دیکھ

رنگ آمیزی حریمِ قدس کی باقی ہے اب
دیکھتا ہوں غیر محفل میں تری ساقی ہے اب
تفرقہ اندازِ ملت آہ ناچاقی ہے اب
تیری امت کی کہاں وہ شہرہ آفاقی ہے اب
روک لے اب ہاتھ جو دینا تھا تو بس دے چکا
خانہ کعبہ تو رکھ بیت المقدس دے چکا

بدر کے جانباز ہیں اس سر زمینِ پاک میں
وہ اگر چاہیں تو ڈالیں زلزلہ افلاک میں
آبرو ملنے لگی ہے یا نبیؐ اب خاک میں
طائرِ اسلام ہے صیاد کے فتراک میں
یوں غلاموں سے خفا آقاؐ نہ ہونا چاہیے
نیل میں فرعونیوں کو پھر ڈبونا چاہیے

خیمہ گاہِ امِ معبد یاد بھی ہے یا نہیں
وقت کیوں عزمِ سفر کا اب مرے آقا نہیں
دبدبہ پہلا سا کیوں فاروق اعظم کا نہیں
فاتحِ کشور مدینہ سے کوئی چلتا نہیں
آئے گا نیل سے آمادۂ پایاب پھر
دور اول یاد کرتا ہے دلِ بے تاب پھر

ملک گیری کا احد والوں میں کیوں ساماں نہیں
بدر کے جانباز کیا اس خاک میں پنہاں نہیں
غزوۂ صفین کے جرار کیوں پرساں نہیں
حالتِ اسلام کیا ہے جسم ہے اور جاں نہیں
نقشہ دکھلا فتحِ ملک خسروِ پرویز کا
ہے زمانہ منتظر شبدیز کے مہمیز کا

ظلمتِ مدفن کو بھولا قید خانہ یاد ہے
کاذب الدعویٰ تری زلفوں کا خانہ زاد ہے
یا شافیع المذنبیں فریاد ہے فریاد ہے
یا شہنشاہِ دو عالم وقتِ استمداد ہے
لفظِ مسلم آج بے معنٰی سا ہو کر رہ گیا
سجدۂ بت کے لیے یعنی مرا سر رہ گیا

دیکھ کر بے حرمتی اسلام کی ایمان کی
رو رہی ہیں اشکِ تفتہ چوٹیاں فاران کی
امتِ مفلس کو پھر حاجت ہے اک عثمان کی
اتقیا کی آنکھ ہے پھر منتظر نعمان کی
پوچھتے ہیں بت بتا دے کیا ترے قرآن میں ہے
کیا کہوں اب درد کی تصویر اک خبردان میں ہے

امتِ مرحوم طوفانِ بلا کی نذر ہے
پھر سر و حلقوم شمشیرِ جفا کی نذر ہے
جس میں تھا تو اب وہ دل تیری ادا کی نذر ہے
ملتِ بیضا خدا والے خدا کی نذر ہے
اڑ گیا خونِ شہیدانِ وفا کا رنگ کیوں
ہے مریضوں سے مسیحا کو خیالِ جنگ کیوں

ہل رہا ہے زلزلہ سے کفر کے فاران بھی
چپکے چپکے دیکھتے ہیں حیدر و عثمان بھی
اب نظر آتے نہیں ہیں بوذر و سلمان بھی
مرثیہ پڑھتے نہیں کیوں حضرت حسان بھی
کوئی ملتا ہی نہیں راہ رو تمہاری راہ کا
اب نہیں سنتا کسی جا نعرہ الا اللہ کا

بزم سے اسلام کی رنگِ طرب جاتا رہا
جو لیا تھا ہم نے ساقی تجھ سے سب جاتا رہا
بادۂ وحدت کا سارا کیف اب جاتا رہا
صبحِ فرقت دیکھتے ہی لطفِ شب جاتا رہا
اتباعِ سنتِ پیغمبری باقی نہیں
شاخ اک بھی کشتِ ملت میں ہری باقی نہیں

ہے وہی دین مبین اور ملتِ بیضا وہی
ہیں وہی تو آپ بھی اور وادئ بطحا وہی
جس کو تم بھی جانتے ہو میں بھی ہوں شیدا وہی
میری آنکھیں بھی وہی حسنِ رخِ زیبا بھی وہی
بے محابا آج پھر زلفِ دوتا کو چھوڑ دے
تیرا قیدی توڑ کر زنجیر پا کو چھوڑ دے

لطف پھر مسلم کو آئے بحر و بر کی سیر میں
دبدبہ پہلا بٹھا دیجے گا قلبِ غیر میں
کیوں لگا رکھی ہے آخر دیر کارِ خیر میں
تیرا مذہب پھیل جائے بت کدا میں دیر میں
یا حبیبِ کبریا اٹھ خواب گاہِ ناز سے
رنگ محفل کا جما دے پھر نئے انداز سے

دیدۂ شیدا میں حسنِ ترک جلوہ گر رہے
ٹوٹ جائے تیغ پر باقی ہمارا سر رہے
ان کی محفل تک نہ پہنچے یوں عدو مضطر رہے
تا قیامت دور میں اسلام کا ساغر رہے
دو اجازت یا نبیؐ پھر نوحؑ کے طوفان کو
صفحہ ہستی سے مٹوا دیجیے یونان کو

جب کیا تھا نذرِ خنجر حلق اسمٰعیلؑ نے
یاد بھی ہے کیا دیا تھا مژدہ جبرائیلؑ نے
کام کھویا اے مسلمانو تمہاری ڈھیل نے
ناک میں دم کر دیا ہے آلِ اسرائیل نے
انا للہ پڑھو انا علیہ راجعون
نحن و مسلم نحن عبداللہ نحن الصادقون

سلطنت سے جس نے سمجھا ہے جدا اسلام کو
اس نے جانا ہی نہیں دین میں ننگ و نام کو
صبح ہو جائے گی گر چھینے گا کوئی شام کو
اے مسلمانو سنو مت فتوہائے عام کو
کفر و ایمان کی لڑائی عنقریب ہونے کو ہے
دیکھیے کس کس کا برگشتہ نصیب ہونے کو ہے

پر اب کچھ بھی نہیں باقی خدا کے قہر میں
بستیاں اجڑیں گی بوم آ کر بسیں گے شہر میں
کیا یہودی بن کے رہ جائیں مسلماں دہر میں
فرق کچھ تو چاہیے تریاق میں اور زہر میں
محوِ حیرت ہوں تماشہ گاہِ عالم دیکھ کر
رو رہا ہوں ملتِ بیضا کا ماتم دیکھ کر

دل ہے وقف کشمکش نومیدئ جاوید کا
جام دے پھر بھر کے ساقی بادۂ توحید کا
دیدۂ خورشیدؔ ہے مشتاق تیری دید کا
آ گلے مل جا سمجھ لے آج ہے دن عید کا
خیر سے بہتر کوئی شر چشمِ فتنہ زا سے ہو
تنگ دنیا پھر تمہارے بادیہ پیما سے ہو

(نوٹ: ابو الظہیر حکیم مولوی خورشید حسن خورشیدؔ و شمس سہارنپوری کی یہ مسدس نظم "تصویرِ غم" کے عنوان سے ۳۲ صفحات کے کتابچے کی صورت میں مصباح الحکمت اخبار کی جانب سے نامعلوم سن میں (غالباً یہ تب کی بات ہے جب خورشید حسن خورشیدؔ سہارنپوری مصباح الحکمت اخبار کے اڈیٹر تھے) شائع ہو چکی ہے۔ جس کی اشاعت کا اہتمام محمد زکریا نے کیا۔)

رباعیات

بخشش کا محمدؐ تری کس سے ہو بیاں
ہر سو تیرا دریائے سخاوت ہے رواں
موسیٰ پہ بھی روشن ہے سرِ طور کرم
جو دی پہ جو دی نوح کو طوفاں سے اماں

رباعی

گر کام مرا مدحِ محمد ہو گا
واللہ کلام کار آمد ہو گا
اس راہ کا سہل مرحلہ ہو گا ہر اک
ہر مصرعہ مرا کلامِ سرمد ہو گا

رباعی

رزاق کو ہے رزق کی تخلیق سے کام
تقسیم کی خاطر نہ سمجھ اس کا غلام
لے رزق پہنچ کے اس کے در پر خورشیدؔ
انسان کی ہے سعی وجہِ انعام

رباعی

بھید کی بات نہیں پردے کا یہ راز نہیں
صاحبِ فن پر تصنع اثر انداز نہیں
نقل ہم پلہ بھی اصل کی خورشیدؔ نہ ہو
دیکھو مقراض کے دو پر تو ہیں پرواز نہیں

رباعی

تقدیر کا اہتمام بے معنی ہے
تدبیر کا انصرام بے معنی ہے
خورشیدؔ اگر ان میں حقیقت ہے کچھ
دنیا میں خدا کا نام بے معنی ہے

رباعی

تقدیر بھی ایک حکمِ ربانی ہے
تدبیر بھی ایک لطفِ سبحانی ہے
بس اس سے زیادہ ہے جو کچھ خورشیدؔ
تیرے لیے باعثِ پریشانی ہے

رباعی

تقدیر کو تقدیر کہو یا تدبیر
جز رنگ نہیں ہے یعنی کچھ بھی تصویر
انساں کو ہے امرِ کسب و سعیٰ خورشیدؔ
اب تو ہی بتا ہمیں کیا ہے تقدیر

رباعی

اک لمحہ کو التماسِ سودا تو کر
دنیا میں کہیں عشق کا چرچا تو کر
آئے گا نظر سنگ بکف طفلِ گہر
دریا میں سرِ حباب پیدا تو کر

رباعی

شکوہ نہ کر اس طلسم کے پانی کا
اک رنگ ہے گل بساط نادانی کا
تہمت کشِ جمیعتِ دل غنچہ مثال
مجموعہ ہوں اوراقِ پریشانی کا

رباعی

تقدیر پہ شاکر جو رہے کامل ہے
تدبیر و تردد جو ہے لا حاصل ہے
جوں دانۂ سبحہ چلتے چلتے خورشیدؔ
عرصہ گزرا مگر وہی منزل ہے

رباعی

پھولوں پہ نظر ہے جستجو تیری ہے
رنگت ہے تری کسی میں بو تیری ہے
ہر سرو جھکا کے سر تجھے ڈھونڈتا ہے
قمری کو تلاش کو بہ کو تیری ہے

رباعی

ظاہر میں اگر باپ خفا ہوتا ہے
باطن میں وہ شاید برملا ہوتا ہے
تو ربِ کریم مجھ سے ناراض سہی
اچھا بھی کہیں بھلا برا ہوتا ہے

رباعی

تدبیر میں کیا کیا خوں پسینہ نہ ہوا
کوئی تقدیر سنورنے کا قرینہ نہ ہوا
بن گیا چشمِ کی صورت بھی سراپا لیکن
افسوس حباب پھر بھی بینا نہ ہوا

رباعی

منتِ کش پیرایہ ہو صورت کیا ہے
تحسین کی سخن گو کو ضرورت کیا ہے
ہم داد کے خواہاں نہیں خورشیدؔ مگر
احباب سے پوچھو تو کدورت کیا ہے

رباعی

ظلمت صفتِ مہر ہے بد گوہر کب
کھوٹے نے کھرے کے پائے ہیں جوہر کب
مانا کہ ہے پا شگاف خارِ صحرا
ہوتا ہے رگِ جنوں کا وہ نشتر کب

رباعی

یہ بھید کھلا ہے جستجو سے تیرا
ہے گل میں عیاں جمال بو سے تیرا
کیا دیر و حرم کہ ہم میخانوں میں
قلقل میں سنا نام سبو سے تیرا

رباعی

موسم بدلے ہے دن بدل جاتے ہیں
سایہ کی طرح شباب ڈھل جاتے ہیں
احباب کو ہنستا دیکھ کر زیرِ فلک
آنسو مری آنکھوں سے نکل جاتے ہیں

رباعی

ہے بھید وہی بات وہی راز وہی
نغمہ ہے وہی پردہ وہی ساز وہی
قل پڑھ کے حرم میں جو کہا زاہد نے
مینا کی ہے میکدہ میں آواز وہی

رباعی

تسبیح سے کام لینے والو جاگو
جنت میں مقام لینے والو جاگو
ہوتی ہے سحر چہک رہے ہیں
اللہ کا نام لینے والو جاگو

رباعی

تو بھید نہ سمجھا نغمے اور نالے کا
کیا تجھ کو پتا ہے بدر اور ہالے کا
کہتی ہے جرس سے شمع سوزِ دل دیکھ
اے چیخنے والے، چاہنے والے کا

رباعی

زلفوں سے سرِ شام سیاہی دیکھی
عارض سے ضیائے صبح گاہی دیکھی
سوت آبِ حیات کا ذقن میں پایا
جو چیز ترے حسن سے چاہی دیکھی

رباعی

وہ گنج گراں مایہ ہوں ویرانے کا
جتنا مجھے ڈھونڈو گے نہیں پانے کا
یا مرد دلوں میں ہوں چراغِ مدفن
محتاج نہیں کسی کے اکسانے کا

رباعی

آنکھیں کھولو بدل رہا ہے عالم
رخصت ہے عروسِ شب کی صبحِ ماتم
ہے رنج کہ شام تک ملے یا نہ ملے
روتی ہے سحر کی آنکھ اشکِ شبنم

رباعی

خواہانِ صفائی آسماں ہوتا ہے
ثابت تھا جو داغ وہ نہاں ہوتا ہے
خورشیدؔ کا ہے مقدمہ پھر صبح
گلشن میں طیور کا بیاں ہوتا ہے

شمشیر کا ہو سپر جو سینہ وہ ہے
ہو جس کی روش بری کمینہ وہ ہے
طاقت سے غلط کام نہ لینا خورشیدؔ
پی کر جو بہک نہ جائے پینا وہ ہے

رباعی

اقبال ہے سر نگوں نصیب الٹا ہے
یہ عصر یہ دور بھی عجیب الٹا ہے
وہ فن کے سفینہ کا نیاز آگیں کیا
جس نے اسے ساحل کے قریب الٹا ہے

رباعی

فاقہ کو جو روزہ کا بدل سمجھے ہیں
مذہب کے معمہ کا نہ حل سمجھے ہیں
لڑتے رہے بھوک پیاس میں سارے دن
افطار کو پھر حسنِ عمل سمجھے ہیں

رباعی

روزہ نے مسلمان بنایا مجھ کو
ایمان نماز سے نہ آیا مجھ کو
اسلام رہا نظر سے دور اے خورشیدؔ
گو کعبہ بھی دولت نے دکھایا مجھ کو

رباعی

ہم نشینوں میں جو بیٹھے تو یہ پہچانا ہے
ہے وہ آرام میں اپنوں سے جو بیگانہ ہے
شمع کے سوز کا باعث ہوئے محفل والے
مثل در گوشہ نشیں ہے جو کوئی دانا ہے

رباعی

بیکار رہینِ سرِ پنہاں ہونا
دشوار قرینِ کہنہ سجاں ہونا
تقدیر پہ منحصر تھی تیری تخلیق
تدبیر سکھائے گی اب انساں ہونا

رباعی

ماہِ رمضاں کی روح گر قرآں ہے
انساں کی شرافت کا سبب ایماں ہے
یوں بھوکے رہو کہ قوم کا پیٹ بھرے
ظاہر ہے جو فاقوں میں غرض پنہاں ہے

رباعی

عید آئی بلا آئی مصیبت آئی
لیکن نہ نظر چاند سی صورت آئی
ہم پر مہہِ نو آگ ہو جاتا ہے
خورشیدؔ برس دن میں قیامت آئی

رباعی

عید آتی ہے عید کی خوشی ہوتی ہے
لیکن انھیں جن کی دل لگی ہوتی ہے
خورشیدؔ سے کیا پوچھتے ہو عید کے دن
غم ہوتا ہے دل میں بے کلی ہوتی ہے

رباعی

خونی کفنوں کی عید کیا ہوتی ہے
مقتل میں کسی کی دید کیا ہوتی ہے
کیوں جان دیا کرتے ہیں عاشق خورشیدؔ
مر کر بھی انھیں امید کیا ہوتی ہے؟

رباعی

مذہب کی کہانیاں سنانے والے
ہیں ہجر کی شب میں جان کھانے والے
منزل کا پتہ نہیں ہے جن لوگوں کو
ہیں ہم کو وہی راہ بتانے والے

رباعی

اللہ عجیب خوئے انسانی ہے
اللہ غضب کی یہ مسلمانی ہے
دیں غیر کی جان نام اپنا کر لیں
-- ہے کہ یہ غیر کی قربانی ہے

رباعی

عارف کی نظر میں دین و دنیا سب ہیچ
عارف کی نظر میں کوہ و صحرا سب ہیچ
ان کے حسن کی مورتوں کے ڈھانچے دیکھو
--- کی نرگس و ثریا سب ہیچ

رباعی

اس بت کی ہیں لاکھ شکایتیں بت خانوں میں
خاکے نئے کھنچ رہے ہیں ارمانوں میں
پہچان کی کیا خطا بتاؤں افسوس
پہچان نہیں رہی ہے دیوانوں میں

رباعی

دنیا کی حقیقت کو سمجھنا بے کار
اللہ کے راز کو سمجھنا بے کار
دنیا دنیا ہے بے حقیقت شے ہے
لیکن ہے لذیز بہ طعامِ مردار

رباعی

جس میں نہ ہو اخوت ہو مسلمان نہیں
جس میں نہ ہو دردِ قوم ایمان نہیں
رسوا ہوا تاج سے رہا جو غافل
بے دین ہے تلوار کا جس کو دھیان نہیں

رباعی

کیا حسنِ بہار اپنا رکھتا ہے پھول
ہے کتنا جمیل اس کا حسنِ مقبول
افسوس کہ یہ حسنِ منظر دو دن
کچھ ایسے نظاروں سے حاصل نہ وصول

رباعی

عرفاں کے بیاباں کی حقیقت جو کہوں
جبریلِ امیں بھی ہے وہاں صید زبوں
کچھاور ہی ڈھونڈے ہے شکاری کی نظر
اللہ پہ مارنے چلا ہے شب خوں

رباعی

رخسار ہیں برگِ گل سے زیادہ پیارے
فردوس میں یا چمک رہے ہیں تارے
دھوکا ہے فریب ہے مگر سب کچھ ہے
ارمان تڑپ رہے ہیں دل کے سارے

رباعی

کیا آنکھ سمجھ گئی ترے حسن کا راز
تھرانے لگا نظر کے تاروں کا ساز
لیکن ہے نظر خموش آنکھیں حیراں
سنگیں سی فضا مگر ہے سب عقل گداز

رباعی

خورشیدؔ کا علم ہے عمل سے خالی
بے برگ ہے اس شجر کی ہر اک ڈالی
باتوں سے بہاروں کا مزہ لوٹتا ہے
ہاتھوں سے نہیں بنتا چمن کا مالی

رباعی

نکلے جو عرب سے وحشیوں کے دستے
الحاد پہ بند ہو گئے سب رستے
سر سبز کہستانوں پہ جھنڈا گاڑا
ان سب نے بیابانوں میں تھے جو بستے

رباعی

ہیں قومِ مسلماں تیرے کیسے افعال
کردار زبوں حسیں ہیں تیرے اقوال
اقوال سے ہوتی نہیں تعبیرِ وطن
کردار سے کر قوم کے گلشن کو نہال

رباعی

اے حسن نہ ہو تُو بھی وفا سے محروم
وہ باغ ہے کیا جو ہو صبا سے محروم
جز داغ فلک کے سینہ پر وہ کیا ہے
کوکب جو ہوا اپنی ضیا سے محروم

رباعی

احساسِ خودی کی داستاں چھیڑ ذرا
اے مردِ مجاہد یہ بیاں چھیڑ ذرا
تقدیر کی تخیل سے بے کار نہ بن
تدبیر کا کچھ سازِ رواں چھیڑ ذرا

رباعی

یہ روح بھی ایک امرِ ربانی ہے
فیضانِ خدا ہے فیضِ ربانی ہے
ہو جو تو سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں
ہے رنگِ فنا بقا میں حیرانی ہے

رباعی

اخگر ہے اگر خام تو دیتا ہے دھواں
آتش بجگر جو ہو تو پھر دود کہاں
ہے خواب تیرا یہ فکرِ بیش و کم کا
--- کے جو آنکھ پھر کہاں سوز و زیاں

رباعی

پانی پہ کنول ہوا سے لہراتا ہے
اس پھول کو دیکھ کر مزا آتا ہے
یہ کاک پہ پانی چیز ہے کیا یا رب!
--- انھیں کے پھول بن جاتا ہے

رباعی

اشغالِ جہاں میں دل پریشاں نکلا
تکلیف میں ہر ایک عیشِ فراواں نکلا
جو ذکرِ الٰہی میں کرے گم سب کچھ
بے فکر وہ ہی بے سر و ساماں نکلا

رباعی

ملحد اسے کہتے ہیں جو سمجھا تیرا راز
کافر ہے وہ جس کی روح میں ہو اعجاز
لفظوں سے غرض ہو جس کی وہ ہے عالم
معنی کا مگر نہ رکھتا ہو کچھ انداز

رباعی

ہے شعبدہ گر کی یہ حجاب اندازی
رومی اسے سمجھا ہے نہ سمجھا رازی
پردے پہ نظر آتا ہے جو کچھ بھی تمھیں
ہنگامہ کائنات ہے خود بازی

رباعی

اک امر ہے تیرا روحِ پاکِ آدم
ہے علم ترا ہی کائناتِ عالم
پردے میں ہے جو وہ تو ہے باہر میں ہوں
ہے کیا من و ما کے تو ہے ایں ہم آں ہم

رباعی

اے آذرِ بت تراش کر یاد ذرا
تھا تیرا خدا کہاں کہاں سے آیا
تو لیتا ہے جس کا نام وہ غیب میں ہے
ظاہر میں جو ہے نہیں وہ بت تیرا خدا

رباعی

اے دوست کنارِ آب محفل کب تک
بہلائے گا لالہ زار میں دل کب تک
طوفان کی موجیں سر پر آ پہنچی ہیں
ڈھونڈے گا تو عافیتِ ساحل کب تک

رباعی

اے دوست یہ دنیا ہے تری خواب خیال
کھل جائے اگر آنکھ خوشی ہے نہ ملال
تو سایہ طایر کو سمجھ کر طایر
پھیلاتا ہے کس لیے ندامت کا جال

رباعی

اے دوست الگ اٹھا لے کھرپا جالی
سبزا بھی ہے ساحل کا ترے بنگالی
بابو ترا دوڑ میں رہا ہے آگے
ہے گھاس سے اس کا پیٹ اگرچہ خالی

رباعی

اے عالمِ اضداد ہمارا عالم
ضد سے ہے یہ ہنگامۂ رنگیں باہم
قائم رہیں کس طرح فنا کی شکلیں
باقی نہ ہو موجود کوئی جب ہمدم

رباعی

اے روح کا راستہ بھلانے والے
دے کر الم و رنج رُلانے والے
کیا خاک میں مل گئی ہے یہ اپنے آپ
حیراں ہیں ترے راز کو پانے والے

رباعی

گلزار کرے جو ربِ جلیل
قربان ہو اس ذات پہ کیوں کر نہ خلیل
دن رات کی تقسیم جو خود کر نہ سکے
وہ پوچھتا ہے ہم سے خدائی پہ دلیل

رباعی

نابود جو اس جہاں میں ہو بود ہے وہ
موجود کے زیرِ سایہ موجود ہے وہ
جان و دل و دیں دے کر خریدا جو کچھ
مقصود ہے وہ نفع ہے سود ہے وہ

رباعی

اے دوست سمجھ کسی کو دنیا میں نہ کم
نیرنگِ خدا ہے کائناتِ عالم
اک ذرہ کے دل کو چیر کر دیکھ ذرا
ہو جائے گا برباد زمانہ ایک دم

رباعی

جب تک نہ احد اکائی بن جائے
ان ذروں کے صفروں میں نہ طاقت آئے
تو صفر کی صفر سے دیا کر ضربیں
تا حاصلِ ضرب صفر ہی رہ جائے

رباعی

مرکز کے لیے قبول ہو بنگالی
مذہب کے لیے زباں ہو نیپالی
ٹیگور بجائے ساز پھر کچھ ایسا
ہندی سے بڑی شان سے ہو قوالی

رباعی

مٹی تری مٹی میں ملے گی اک روز
بنتا ہے تو کس واسطے دولت اندوز
یہ کاخ یہ ایواں یہ محل چھوڑنے ہیں
کر ساز پہ ہستی کے رواں نغمۂ سوز

رباعی

اردو کو اک لگاؤ زبانِ عرب سے ہے
اس واسطے زبانوں میں اونچی وہ سب سے ہے
۔۔ کے روبرو نہ گنواں آبروئے دیں
۔۔ میں جو بغض انھیں اردو ادب سے ہے

رباعی

مذہب ہے کوئی کوئی ہو اس کا بانی
شامل ہے سبھی کے دودھ میں کچھ پانی
پھر سب میں صداقت بھی حماقت بھی ہے
بے عیب سمجھنا ان کو ہے نادانی

رباعی

ملا کو تو ہے سحر بیانی حاصل
تفہیم ہے قرآن کی لیکن مشکل

(نوٹ:اس رباعی کے بس دو ہی مصرعے دستیاب ہو سکے)

قطعات

کس لیے قصہ قیامت کا سناتے ہیں مجھے
زاہدانِ خشک کیوں اتنا ڈراتے ہیں مجھے
ہوں سیہ کاری میں یکتا مثلِ سرمہ گرچہ میں
جو نظر رکھتے ہیں آنکھوں میں بٹھاتے ہیں مجھے

قطعہ

ولی نہیں ہوں نبی بھی نہیں بشر ہوں میں
مجسمہ ہوں گناہوں کا شکلِ شر ہوں میں
بجز ترے کوئی بے عیب اس جہاں میں نہیں
گناہ کیا ہے گنہ گار ہی اگر ہوں میں

قطعہ

میں نظامی ہوں نہ جامی ہوں نہ خاقانی ہوں
مکی الاصل ہوں صائب ہوں نہ قاآنی ہوں
خود ستائی کی نہیں ہے مجھے حاجت خورشیدؔ
خود سخن ور ہی یہ کہہ دیں گے کہ لا ثانی ہوں

قطعہ

قطرہ میں قلزمِ عرب تہہِ افلاک ہوں میں
اشکِ غم ہوں کبھی آنکھوں میں طرب ناک ہوں میں
سر بر آردۂ مژگاں جسے تم دیکھ چکے
اب وہی اشکِ نگوں ساز سرِ خاک ہوں میں

قطعہ

بحرِ اشجار سے مضموں کے گہر رولتے ہیں
وزن پاتے ہیں بہت فکر میں جب تولتے ہیں
آتشِ رشک سے بت خانہ دہن ہیں سارے
گھنگینا منھ میں ہیں اعدا کے نہیں بولتے ہیں

قطعہ

ہمیں تو بندشِ مضموں کے ہے پناہ سے کام
غرض ہے آہ سے کچھ اور نہ واہ واہ سے کام
مرے کلام کا خورشیدؔ کاغذی ہے ثبوت
وکیل کی ہے ضرورت نہ کچھ گواہ سے کام

قطعہ

شاعر ہے تو شاگرد بھی قوال کا ہو
آگاہ ہر اک سُر کا ہر اک تال کا ہو
خورشیدؔ تو ہو رہینِ ساز و آواز
شاگرد نہ اکبر کا نہ اقبال کا ہو

قطعہ

اشرف جو سمجھتے ہیں تو جلتے ہیں رذیل
فرمائے نمرود ہے اچھا کہ خلیل
لاحول ولا قوۃ الا باللہ
فرعون کو ٹھہراتے ہیں موسیٰ کا مثیل

قطعہ

جس بزم میں ہوں کوکب باور ہوں میں
خورشیدؔ کے آسماں کا اختر ہوں میں
میں ہوں نہ جہاں نہ ہوں صفت میری رہے
ہر جملہ میں محذوف و مقدر ہوں میں

قطعہ

خورشیدؔ کی محفل کے کواکب ہم ہیں
ثابت بھی ہیں سیارہ بھی ثاقب ہم ہیں
جس چرخ پہ مضمون لکھے جاتے ہیں
وہ جائے عطارد نہیں کاتب ہم ہیں

قطعہ

مجھ کو حصولِ فیض ہے خورشیدؔ سے مدام
جو تھے فلک پہ میری طبیعت کا ہے مقام
ہے ابتدائے فکرِ سخن شکلِ انتہا
عشرت مرا سخن ہے ہر اک عشرتِ کلام

قطعہ

الفاظ سے گزرا ہے تو معنی سے گزر
شذرہ سے گزر کھول کے اپنے شہپر
پرواز ہے تیری لا مکاں کی جانب
لاہوت کے دریا سے بھی چن لے گوہر

حرف و معنی کی دنیا میں موضوعات اور فکر کے نئے آسمان تخلیق کرنا شعرا اور ادبا کا طرۂ امتیاز ہے، مگر بسا اوقات وقت کی گرد تماشائیوں کی بصارت پر یوں جم جاتی ہے کہ وہ ان آفتابوں کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایسے میں کوئی صاحبِ دل اور دیدہ ور، ابرِ باراں کی طرح اترتا ہے، فضائے ادب کی کثافتوں کو دھوڈالتا ہے اور نئے باسیوں کے لیے پرانے آسمانوں کے بند دریچے کھول دیتا ہے۔

اسلاف کے علمی ترکے کی حفاظت اور ان کے شعری وقار کی سربلندی، نووارداِن تحقیق کا فریضۂ منصبی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر کا ایک درخشندہ ستارہ، یعنی صاحبِ اسلوب شاعر خورشید حسن خورشید سہارن پوری، جن کا کلام وقت کے بے رحم تھپیڑوں میں گم ہو چکا تھا، اس کی بازیافت دراصل ایک پوری تہذیبی جنت کی بازیافت ہے۔ اور تحقیق و تدوین کا یہ خارزار، نوجوان محقق شعبان جھلن شعبان نے اپنی شبانہ روز محنت سے سر کر لیا ہے۔

ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ خورشید حسن خورشید اور شعبان جھلن شعبان کے ناموں میں عروضی و لسانی مماثلت ہے؛ دونوں کے نام سہ حرفی اور ہم وزن ہیں۔ خورشید سہارن پوری جیسے نادرِ روزگار شاعر کے بکھرے ہوئے سرمائے کو یکجا کرنا شعبان کے ذوقِ سلیم کا بین ثبوت ہے۔

اس تدوین میں نظم کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ نظم، تخیل کے صنم کدے میں سجی وہ بزمِ غنا ہے جہاں فکر کے 'ساتوں سُر' ایک ہی کیفیت میں الاپے جاتے ہیں۔ تسبیح کے دانوں کی مانند اس کا ہر مصرع دوسرے مصرعے سے مربوط ہوتا ہے، جس کے اندر شاعر کی روح دھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔ خورشید سہارن پوری کی نظمیں بھی خیال، خواب اور سراب کی تمام بوقلمونیوں سے گزرتی ہوئی قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں۔

اس وقیع علمی کام کے ذریعے شعبان نے اربابِ نقد و نظر میں اپنا لوہا منوالیا ہے۔ حق تعالیٰ اس ادبی سفر میں ان کا حامی و ناصر ہو، ان کے قلم کی حرمت سلامت رہے اور وہ علم و ادب کی یوں ہی آبیاری کرتے رہیں۔ آمین۔

دعاگو

ڈاکٹر شہباز نیّر